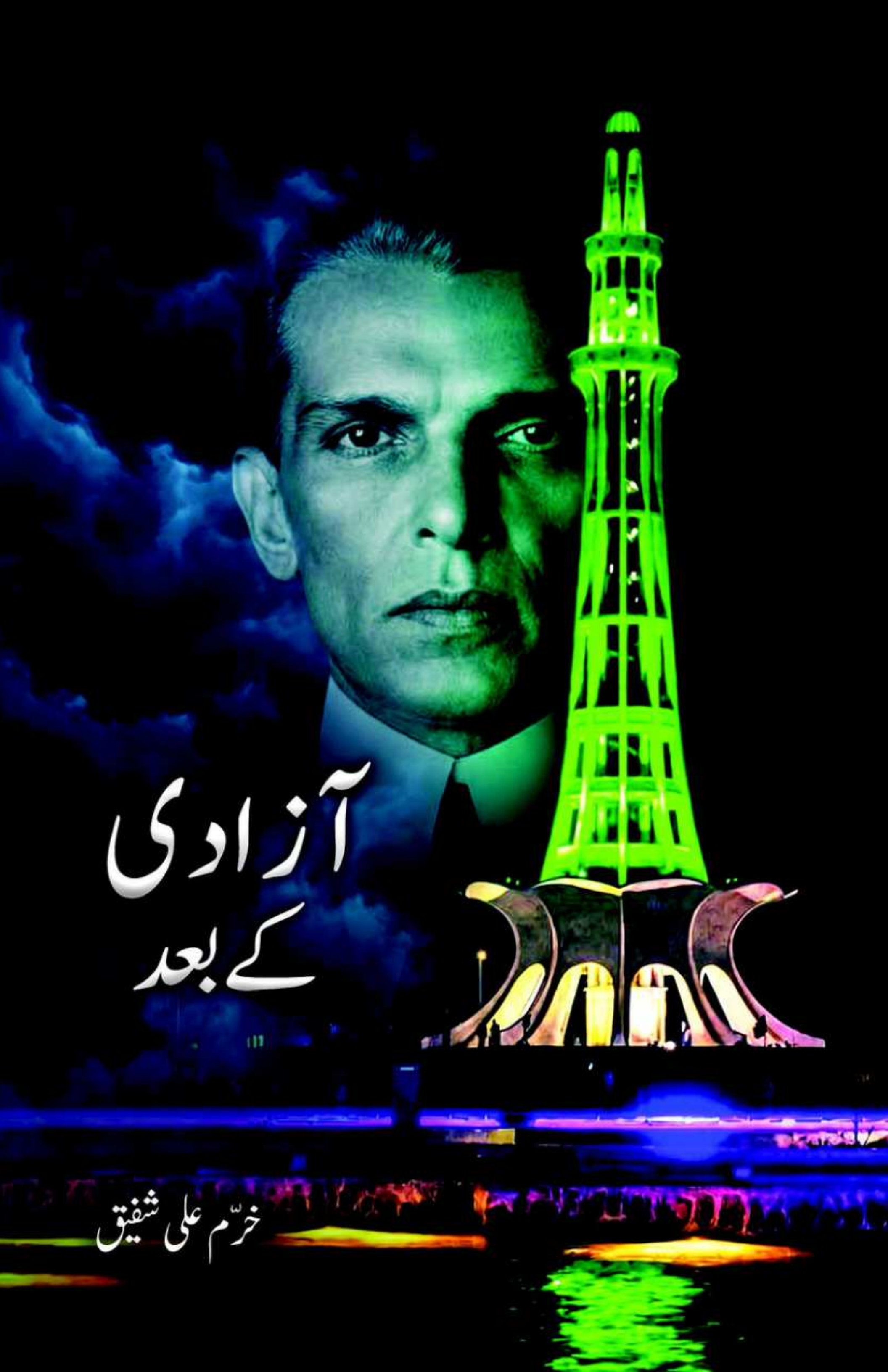

آزادی
کے بعد
خرّم علی شفیق

آزادی کے بعد

۱۹۴۷ء سے ۲۰۲۶ء تک پاکستان کی تاریخ
آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے

خرّم علی شفیق

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

ISBN: 978-627-7400-01-9

ناشر:

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

Millat College Building
Near Khana Pul, Service Road East
VIP Ghauri Town, Islamabad Expressway
Islamabad, Pakistan
Phone: +92512248915
Email: info@alhijrah.pk

پہلی بار پاکستان میں الہجرہ سکولز ٹرسٹ نے ۲۰۲۶ء میں طبع کروا کے شائع کی۔

میرِ کارواں ہم تھے، رُوحِ کارواں تم ہو
ہم تو صرف عنواں تھے، اصل داستاں تم ہو
نفرتوں کے دروازے خود پہ بند ہی رکھنا
اِس وطن کے پرچم کو سربلند ہی رکھنا

کلیم عثمانی

فہرس

پہلی بات 7

حصہ اول– مسلم لیگ کا نقطۂ نظر 9

باب ۱ غریب شہزادی 11

باب ۲ ”مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ“ 15

باب ۳ دین اور دنیا 22

باب ۴ سنہرے سال 29

باب ۵ مسلم لیگ کا علمی اثاثہ 37

باب ٦ ہمارا عمرانی معاہدہ 42

حصہ دوم–ہماری تاریخ کے سات مراحل 49

باب ۷ پہلے تین مراحل 51

باب ۸ نیا حوصلہ، ۱۹۴۷ء سے ۱۹٦٦ء 63

باب ۹ ہم ایک ہیں، ۱۹٦۷ء سے ۱۹۸٦ء 72

باب ۱۰: کابل سے لندن تک، ۱۹۸٦ء سے ۲۰۰۷ء ... 79

باب ۱۱: آخری معرکہ، ۲۰۰۷ء سے ۲۰۲٦ء 87

ضمیمے 103

قراردادِ دہلی ۱۹۴٦ء 103

مسلمانوں کا حلف 106

پہلی بات

اگر آپ غیر جانبداری کے ساتھ لکھی ہوئی تاریخ پڑھنا چاہتے ہیں جس میں پاکستان کے وجود سے لے کر اس کے مستقبل تک ہر چیز کو مختلف زاویوں سے دیکھا گیا ہو تو آپ غلط کتاب کھول بیٹھے ہیں۔ یہ کتاب آپ کے لیے نہیں ہے۔

یہ کتاب پاکستانی قوم کی کہانی صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے بیان کرتی ہے (اور یہاں مسلم لیگ سے مُراد اصل مسلم لیگ ہے، موجودہ ہم نام جماعتیں نہیں)۔

ہماری ایک عجیب و غریب بد قسمتی ہے۔ آزادی سے پہلے مسلمانوں کے کچھ مخصوص گروہوں کو چھوڑ کر باقی تمام مسلمانوں کا ایک ہی بیانیہ ہوتا تھا اور اُسی مشترکہ بیانیے کی بنیاد پر، بلکہ شاید اُس کی وجہ سے، پاکستان وجود میں آیا۔ لیکن پاکستان کے وجود میں آتے ہی پڑھے لکھے پاکستانی اُس نقطۂ نظر کو بھول گئے۔

ابھی تک میری نظر سے پاکستان کی کوئی ایسی تاریخ نہیں گزری ہے جو خالص مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہو۔ سید حسن ریاض اور مطلوبُ الحسن سید جیسے بزرگ قیامِ پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کی آواز تھے اور ہمارے محسنوں میں سے ہیں، مگر اُن کی تصانیف بھی مکمل طور پر اِس شرط کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہیں۔

کیا اِس یتیم اور مظلوم پاکستانی قوم کو اِتنا حق بھی حاصل نہیں ہے کہ کم سے کم ایک دفعہ یہ اپنے آپ کو اُس جماعت کی نظر سے بھی دیکھ لے جس نے اِسے یہ ملک بنا کر دیا

تھا؟ یہ کتاب صرف اِتنا ہی کرتی ہے۔ نہ اِس سے کم اور نہ اِس سے زیادہ!

مجھے اِس سے غرض نہیں ہے کہ مسلم لیگ کا نقطۂ نظر صحیح تھا یا نہیں تھا۔ یہ فیصلہ آپ خود کر لیجیے۔ میں تو صرف اُس جماعت کا ایک ایماندار وکیل ہُوں۔ میری ذمہ داری صرف اِتنی ہے کہ اُس جماعت کا نقطۂ نظر پیش کر دُوں اور ایسا کرتے ہوئے کسی فریق سے کوئی ایسی بات منسوب نہ کروں جو اُس فریق نے مصدقہ طور پر نہیں کہی تھی۔

اِس سیریز کی دُوسری کتابوں کی طرح اِس کتاب کی پیشکش کے لیے بھی مَیں الہجرہ سکولز ٹرسٹ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہُوں، جس کا مقصد اعلیٰ تعلیم فراہم کر کے اسلام کے معاشرتی انصاف کے اصولوں پر مبنی معاشرے کے قیام کی راہ ہموار کرنا ہے۔ بالخصوص اِس ادارے کے بانی عبدالکریم ثاقب صاحب کی حوصلہ افزائی اور اِدارے کے تحت چلنے والے اسکول کے سابق طالبِ علم اسرار احمد کی معاونت کے لیے مَیں اُن کا شکرگزار ہُوں۔

اِس کتاب کا زیادہ تر حصہ دسمبر ۲۰۲۵ء میں لکھا گیا اور جنوری ۲۰۲۶ء کے اوائل میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ چنانچہ جنوری ۲۰۲۶ء سے آگے کے واقعات کے بارے میں اندازہ لگاتے ہوئے مستقبل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

خرّم علی شفیق

۷/اپریل ۲۰۲۶ء

حصہ اول

مسلم لیگ کا نقطۂ نظر

باب ۱

غریب شہزادی

وہ کون تھی؟

صوفیوں نے صدیوں تک اُس کے خواب دیکھے۔ شاعروں نے اُس کے حسن کی تعریف میں شہ پارے تخلیق کیے۔ مفکروں نے اُسے آسمانی دلہن تصوّر کیا اور بادشاہوں نے اُسے زمین پر لانے کے لیے اپنے تاج و تخت قربان کر دیئے۔ اُسے ایک سیاسی جماعت سمجھا گیا لیکن وہ اس سے زیادہ تھی۔ اُسے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے پہچانا گیا لیکن نظامی گنجوی کی لیلیٰ، بھٹائی کی ماروی اور وارث شاہ کی ہیر بھی وہی تھی:

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اُس میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے

آل انڈیا مسلم لیگ برصغیر کے مسلمانوں کی نمایندہ تنظیم تھی جسے ۱۹۰۶ء میں قائم کیا گیا۔ جب برصغیر کی دوسری سیاسی تحریکیں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے میں ناکام ہو گئیں تو مسلم لیگ نے فروری ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کو برصغیر چھوڑنے کا اعلان کرنے پر مجبور کیا اور اگست ۱۹۴۷ء میں یہاں دو آزاد خود مختار ریاستیں قائم کروادیں۔ اُن میں سے ایک پاکستان ہے (جس میں اُس وقت بنگلہ دیش کا علاقہ بھی شامل تھا) اور دُوسری ریاست بھارت ہے۔

یہ تمام واقعات اچھی خاصی وضاحت کے ساتھ اِس سریز کی کتاب آزادی میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہاں اِن کا حوالہ صرف اِس لیے پیش کیا گیا ہے کہ واضح ہو سکے کہ وہ تنظیم کیا

تھی جس کے نقطۂ نظر سے پاکستان کی تاریخ اِس کتاب میں پیش کی جارہی ہے۔

*

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لیجیے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کسی فرد یا گروہ نے قائم نہیں کی تھی بلکہ برصغیر کے تمام مسلمانوں کے درمیان صلاح مشورے سے قائم کی گئی تھی۔ اِس کا مقصد کسی مخصوص شخصیت یا نظریے کو اقتدار میں لانا نہیں تھا بلکہ ملّت کا کوئی بھی گروہ اپنا نظریہ یہاں پیش کر سکتا تھا۔

اِس بات کو ٹھیک سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر لیگ اِس نظریے پر قائم ہوئی تھی کہ برصغیر کے مسلمان چونکہ ایک علیحدہ سیاسی وجود (یا دوسرے لفظوں میں ایک علیحدہ ملّت یا قوم ہیں)، اِس لیے انہیں بھی اپنے الگ نمایندے منتخب کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ چند گنے چنے مسلمان اس کے بجائے یہ سمجھتے تھے کہ نہ مسلمان ایک قوم ہیں اور نہ ہی انہیں الگ نمایندے منتخب کرنے کی ضرورت ہے بلکہ انہیں ہندوؤں اور دوسری قوموں میں ضم ہو کر صرف ہندوستانی بن جانا چاہیے۔ یہ لوگ بعد میں نیشنلسٹ مسلمان کہلائے۔ انہیں بھی اجازت تھی کہ وہ لیگ کے پلیٹ فارم پر آکر اپنے خیالات پیش کریں اور اگر وہ اکثریت کو متفق کر لیں تو لیگ بھی اپنی پالیسی تبدیل کر سکتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۹ء تک نیشنلسٹ مسلمانوں نے لیگ میں شامل ہو کر زور شور کے ساتھ یہ کوشش بھی کی لیکن مسلمانوں کی اکثریت کو قائل نہ کر سکے۔

بالکل اسی طرح بعض مسلمان کمیونزم کے قائل تھے، بعض اسلام کے حوالے سے مختلف نظام پیش کرتے تھے اور بعض اسی طرح کے دوسرے نظاموں کے حامی تھے۔ انہیں بھی لیگ کی طرف سے کھلی دعوت تھی کہ وہاں جا کر اپنے نظریات پیش کریں اور اگر مسلمانوں کی اکثریت ان میں سے کوئی نظریہ قبول کرلے تو لیگ بھی وہی نظریہ اپنا

لے گی۔ چنانچہ لیگ کے اجلاسوں میں ہمیں مغربی نظریات کے حامی بھی دکھائی دیتے ہیں اور دینی علماء بھی رونق افروز نظر آتے ہیں۔ لیکن آخر میں لیگ کی پالیسی وہی بنتی تھی جس پر سب کا اتفاق ہو جائے یا مسلمانوں کی اکثریت تمام خیالات کو سننے کے بعد جس پالیسی کو اختیار کر لے۔

ہم ذرا آگے بڑھ کر شاید یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان لیگ کے پلٹ فارم پر مسلمانوں کی اکثریت کو اِس بات پر قائل کر لیتا کہ مسلمانوں کی کوئی علیحدہ سیاسی تنظیم ہونی ہی نہیں چاہیے بلکہ تمام مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانا چاہیے تو لیگ کے رہنما لیگ ہی کو ختم کرنے کا اعلان کر دیتے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں لیگ نے پاکستان کا مطالبہ بھی اِسی بنیاد پر کیا کہ یہ مسلمانوں کی اکثریت کا مطالبہ ہے۔ چنانچہ تحریکِ پاکستان کے ہر مرحلے پر قائداعظم نے انگریزوں سے یہی کہا کہ وہ عام انتخابات کروا کے مسلمان عوام سے فیصلہ کروا لیں۔ اگر مسلمانوں کی اکثریت پاکستان کے خلاف ووٹ دے دیتی تو لیگ بھی پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو جاتی۔

یہ سب کچھ ہماری موجودہ ذہنیت سے اتنا مختلف ہے کہ آج شاید ہمارے ذہنوں کے لیے اِس بات پر یقین کرنا بھی مشکل ہو کہ واقعی لیگ کی پالیسی یہی تھی۔ لیکن اِس سیریز کی پچھلی کتاب آزادی میں، اور اُس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ علامہ اقبال کی سوانح پر میری تین کتابوں اقبال کی جستجو، اقبال کا راستہ اور اقبال کی منزل میں، اُس زمانے کے تمام اہم واقعات قارئین کے سامنے رکھ دیئے گئے ہیں۔

جب ایک دفعہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے تب شاید آپ بھی اُس گزرے ہوئے زمانے کے مسلمانوں کی طرح اِسی نتیجے پر پہنچیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ اور برصغیر کی

مسلمان قوم ایک ہی وجود کے دو نام تھے۔یعنی بر صغیر کے تمام مسلمانوں کو جب سیاسی حیثیت میں دیکھا جائے گا اُنہیں آل انڈیا مسلم لیگ ہی کہا جائے گا:

باطل سے نہ ڈر تیرا ہے خدا   پردے سے نکل کر سامنے آ
ایمان کی قوّت دل میں بڑھا   مرکز سے سرک کر دُور نہ جا
مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

(افضل ہاپوڑی)

باب ۲

"مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"

پچھلے باب میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جو حیثیت بیان کی گئی ہے، اُس کی وجہ سے یہ تنظیم اِس خطے میں اسلام کی ہزار بارہ سو سالہ موجوگی کا نتیجہ تھی۔ یہ مسلمانوں کے اُس طویل دورِ حکومت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی جو محمد بن قاسم سے شروع ہو کر بہادر شاہ ظفر پر ختم ہُوا تھا۔ گویا مغل سلطنت کی جائز وارث تھی جو غربت میں پیدا ہوئی اور جمہوری فضا میں پروان چڑھی:

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گُہر اِس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں
وادیِ گُل، خاکِ صحرا کو بنا سکتا ہے یہ
خواب سے اُمّیدِ دہقاں کو جگا سکتا ہے یہ
ہو چُکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور[1]

---

[1] اقبال، 'گورستانِ شاہی'، بانگِ درا، ص ۱۶۵

*

''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' ایک ایسا نعرہ تھا جو تحریکِ پاکستان کے زمانے میں مسلمانوں کے بچے بچے کی زبان پر تھا۔ لیکن یہ صرف ایک عوامی نعرہ نہیں تھا۔ یہ قائداعظم محمد علی جناح کا مکمل سیاسی فلسفہ تھا اور اُس زمانے سے تھا جب وہ قائداعظم نہیں بنے تھے بلکہ مسلم لیگ کے رُکن بھی نہیں تھے۔

دسمبر ۱۹۰۶ء میں جب ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم کی جا رہی تھی تو نوجوان جناح اُس میں شامل ہونے کے بجائے انہی دنوں کلکتہ میں ہونے والے کانگرس کے اجلاس میں شریک ہوئے جہاں اُنہوں نے کہا کہ مسلمانوں کو علیحدہ سیاسی تنظیم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن بہت جلد اُنہوں نے اپنی بات پر نظرِ ثانی کی اور ۱۹۰۹ء سے اُن کا یہی موٴقف سامنے آنے لگا کہ مسلمانوں کے تمام اجتماعی معاملات مسلمانوں کی اپنی مرضی سے طے ہونے چاہئیں۔[1]

جلد ہی وہ کھل کر کہنے لگے کہ ایک مسلمان کی حیثیت میں اُن کا فرض ہے کہ وہ مسلم لیگ کے فیصلوں کی تعمیل کریں خواہ اُن کی اپنی رائے اُن فیصلوں کے برعکس ہو۔ یہ بات تفصیل کے ساتھ آزادی میں واضح کی جا چکی ہے۔ مثلاً ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان وہ معاہدہ ہوا جسے میثاقِ لکھنوٴ کہا جاتا ہے تو جناح نے کہا کہ ''میری ذاتی رائے جو کچھ بھی ہو لیکن یہاں میرا یہی فرض ہے کہ مسلمانوں کی کثیر التعداد جماعت کی رائے کی ترجمانی کروں جس کا آل انڈیا مسلم لیگ سیاسی آلہ ہے۔''[2]

تیرہ برس بعد یعنی ۱۹۲۹ء میں، جب سیاسی حالات بدل گئے اور جناح نے مسلمانوں

---

[1] Riaz Ahmad (1988), *Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah: The Formative Years 1892-1920*, pp. 86-88

[2] Jinnah, *An Ambassador of Unity,* p.21, 45 ۔ زبیری، سیاستِ ملیہ، ص119

کے نئے مطالبات چَودہ نکات کی صورت میں پیش کیے تو وہ بھی اُن کے ذاتی خیالات نہ تھے بلکہ مسلمانوں کی اکثریت کی رائے تھی جسے جناح نے لیگ کے حکم کے مطابق اکٹھا کر دیا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے بالکل صاف الفاظ میں کہا، ”یہ تاثر موجود ہے کہ میں نے لیگ کی کونسل کے سامنے جو قرارداد پیش کی ہے [یعنی چَودہ نکات]، وہ میرے ذاتی خیالات پر مشتمل ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔“[1]

چنانچہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اگر میثاقِ لکھنؤ، چَودہ نکات اور مطالبۂ پاکستان کے درمیان کچھ فرق دکھائی دیتا ہے تو وہ جناح کے اپنے نظریات کے بدل جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ مسلم لیگ کی اجتماعی فکر کے ارتقا کی وجہ سے ہے۔

جہاں تک جناح کا تعلق ہے، اُنہوں نے اپنی سیاسی زندگی کے آغاز سے اختتام تک ہر ہر قدم پر مسلم لیگ کی بالکل اُسی طرح اطاعت کی جس طرح قرآن شریف کا حکم ہے کہ خدا اور رسولؐ کے بعد اُس کی اطاعت کرو جسے تم نے اپنے درمیان اقتدار تفویض کیا ہو (اُولی الامر منکم)۔

لہٰذا وہ دُوسرے مسلمانوں سے بھی یہی تقاضا کرتے تھے کہ وہ مسلم لیگ کی غیر مشروط اطاعت کریں۔ مثلاً ۱۹۴۳ء میں دہلی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اُنہوں نے لیگ کو ”ملّت کی طاقت“ قرار دیا، ”جس کے سامنے آپ کو ضرور جھکنا ہے خواہ آپ دنیائے اسلام کا سب سے اُونچا درخت ہوں۔“[2]

*

قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائداعظم کے اِس مؤقف میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

---

[1] Mitra, *Indian Annual Register, Jan.-June 1929,* p.367

[2] Yusufi, *Speeches, Statements and Messages of the Quaid-e-Azam,* p.1691

دسمبر ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستانی شاخ کا نام پاکستان مسلم لیگ رکھا گیا (اِس کا پاکستان کی کسی موجودہ سیاسی جماعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ جماعت ۱۹۵۳ء میں اقتدار سے محروم ہونے کے چند برس بعد ختم ہو گئی، جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے)۔ بھارتی شاخ کا نام انڈین یونین مسلم لیگ رکھا گیا۔

اُس موقع پر بھی قائداعظم نے بھارت کے مسلمانوں سے کہا، ”ہندوستان [بھارت] میں ایک مسلم لیگ ضرور ہونی چاہیے۔ اگر آپ اِس کے سوا کچھ اور سوچ رہے ہیں تو آپ ختم ہو جائیں گے۔“[1]

بالکل اِسی طرح پاکستان کے مسلمانوں کے لیے بھی قائداعظم کی واضح ہدایت تھی کہ وہ سب مسلم لیگ ہی میں شامل رہیں اور کوئی دوسری سیاسی جماعت نہ بنائیں کیونکہ جس طرح مسلم لیگ نے پاکستان بنایا ہے اُسی طرح پاکستان کی تعمیر بھی اِسی تنظیم کا کام ہے۔

قائداعظم نے یہ ہدایت کئی مواقع پر دہرائی۔ مثال کے طور پر ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا، ”اگر آپ پاکستان کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ پاکستان کی تعمیرِ نَو کرنا چاہتے ہیں، تو میں کہتا ہوں کہ ہر مسلمان کے لیے دیانتداری کا تقاضا یہی ہے کہ وہ مسلم لیگ جماعت میں شامل ہو اور اپنی بہترین صلاحیتوں کے مطابق پاکستان کی خدمت کرے۔“[2]

*

چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ قائداعظم نے کبھی ایک ایسے پاکستان کا تصوّر پیش نہیں کیا تھا جہاں مسلم لیگ کے سِوا کسی اور جماعت کی حکومت ہو۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں

---

[1] Syed Sharifuddin Pirzada (2008), *AIML Centenary Souvenir*, p.352

[2] Public address on March 21, 1948; Yusufi, *op. cit.,* p. 2720

کوئی دوسری جماعت بنانا اُن کے تین سنہرے اصولوں "ایمان، اتحاد، نظم وضبط" میں سے اتحاد کی واضح نفی ہے بلکہ قائداعظم کے لحاظ سے تو ایمان اور نظم وضبط کے منافی بھی ہے۔

یہ بات ہمارے دانشوروں اور مذہبی اور غیر مذہبی سیاستدانوں نے خواہ جان بوجھ کر ہم سے چھپائی ہو، خواہ وہ خود ہی اِس بات سے بیخبر رہے ہوں، بہر حال حقیقت یہی ہے۔

*

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قائداعظم پاکستان میں یک جماعتی نظام (One-Party Rule) چاہتے تھے؟

یک جماعتی نظام سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ملک پر کسی ایک جماعت کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو اور اُس کے مقابلے پر کوئی دُوسری جماعت بنانے کی اجازت نہ ہو۔ یہ نظام عام طور پر کمیونسٹ ممالک میں رائج ہوتا ہے، جن میں سب سے مشہور مثالیں چین اور رُوس ہیں۔

اِس کے برعکس عام طرز کی مغربی جمہوریت میں، جو ہمارے یہاں بھی رائج ہے، ایک سے زیادہ جماعتیں ہوتی ہیں۔ وہ سب ایک دُوسرے کے خلاف انتخاب میں حصہ لیتی ہیں۔ جس جماعت کو زیادہ ووٹ مل جائیں وہی حکومت کرتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم اِن دونوں میں سے کوئی نظام بھی نہیں چاہتے تھے کیونکہ مسلم لیگ اُس قسم کی سیاسی جماعت تھی ہی نہیں جیسی یک جماعتی نظام یا مغربی جمہوریت میں ہوتی ہے۔

اُن دونوں صورتوں میں ایک سیاسی جماعت کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ ایسے افراد کا گروہ ہوتا ہے جو باقی قوم سے علیحدہ ایک نظریہ رکھتے ہیں اور اُسے پورے ملک پر نافذ کرنے کے لیے اکثریت کی تائید حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسلم لیگ کوئی ایسا نظریہ نہیں رکھتی تھی جو باقی قوم سے علیحدہ ہو

اور خاص مسلم لیگ کے لیڈروں کے ذہن کی پیداوار ہو۔ مسلم لیگ تو پوری قوم کے لیے ایک سیاسی پلیٹ فارم تھی جہاں قوم کا کوئی بھی فرد یا گروہ اپنے خیالات پیش کر سکتا تھا۔ لیگ کی طرف سے پیش کیے گئے منصوبے اُس کے اپنے لیڈروں کے ذہنوں کی پیداوار نہیں ہوتے تھے بلکہ عام مسلمانوں کی رائے پر مبنی ہوتے تھے جیسا کہ آپ میثاقِ لکھنوٴ، چَودہ نکات اور دوسری مثالوں کے حوالے سے دیکھ چکے ہیں۔

اِس سے ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی حکومت کا مطلب یک جماعتی نظام نہ تھا۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس اس سے مراد یہ تھی کہ پوری قوم مل کر متفقہ فیصلے کرے جیسا کہ اسلام کا حکم ہے۔

پاکستان کے حوالے سے اُس قوم میں غیر مسلم بھی شامل تھے۔ اُن کے بارے میں مسلم لیگ کے وژن کی تفصیل تو آگے اپنی جگہ پر آرہی ہے لیکن مختصر طور پر یہ جان لیجیے کہ اسلام نے مدینہ کی پہلی ریاست ہی کے زمانے سے غیر مسلم شہریوں کو سیاسی مشاورت میں شریک رکھا تھا۔ لہٰذا ممکن تھا کہ پاکستان میں کچھ عرصے بعد غیر مسلموں کو بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اختیار دے دیا جاتا۔

بہرحال مسلم لیگ کے نقطہٴ نظر سے پاکستان کے غیر مسلم شہری بھی ریاست کے اعلیٰ عہدوں کے لیے برابر کے حق دار تھے جن میں وزیرِ اعظم کا عہدہ بھی شامل تھا۔ ۱۹۳۲ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے دوران برصغیر کے تمام مسلمان رہنماؤں نے یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ اپنے معاہدے میں بھی یہ بات لکھی تھی کہ ایک غیر مسلم شہری بھی ایک اسلامی ریاست کا وزیرِ اعظم بن سکتا ہے۔ اس کا ذکر آزادی میں آچکا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کی منظوری کے وقت لیاقت علی خاں نے بھی بالکل صاف الفاظ میں یہ بات واضح کی تھی۔

اِس لیے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قائداعظم نے ایک ایساسیاسی نظام پیش کیا تھا جہاں ”پوری قوم مل کر متفقہ فیصلے کرے“ تو پاکستان کے حوالے سے اُن فیصلوں میں پاکستان کے غیر مسلم شہری بھی پاکستانی قوم کا حصہ ہونے کے لحاظ سے برابر کے شریک سمجھے گئے تھے۔

باب ۳

دین اور دنیا

اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ مسلم لیگ صرف سیاسی معاملات ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں مسلمانوں کی اطاعت کی مستحق تھی۔ ان شعبوں میں ادب، ثقافت اور تعلیم سے لے کر دینی معاملات تک سب کچھ شامل تھا:

مذہب ہو تہذیب کہ فن　　　تیرا جداگانہ ہے چلن
اپنا وطن ہے اپنا وطن　　　غیر کی باتوں میں مت آ
پاکستان کا مطلب کیا؟
لا الٰہ اِلّا اللہ

اصغر سودائی

جب قائداعظم نے کہا تھا کہ ہر مسلمان کو ملّت کی طاقت کے سامنے جھکنا ہے "خواہ آپ دنیائے اسلام کا سب سے اُونچا درخت ہوں"[1] تو اُنہوں نے علمائے کرام کو استثنیٰ نہیں دیا تھا۔

۱۹۳۷ء میں تو اُس زمانے کے جلیل القدر عالمِ دین مولانا اشرف علی تھانوی نے یہ سوال باقاعدہ طور بھی مسلم لیگ کے سامنے اِن الفاظ میں پیش کیا تھا کہ "اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو کیا اُن کو بھی الیکشن ہی کے ذریعے کوئی درجہ حاصل ہو گا جس سے

[1] Yusufi, *Speeches, Statements and Messages of the Quaid-e-Azam,* p.1691

ان کو مسلم لیگ کے اجلاس اور مجلسِ عاملہ وغیرہ میں اپنی رائے پیش کرنے کا حق حاصل ہو؟" مسلم لیگ کی طرف سے تحریری طور پر جواب دیا گیا جو کچھ یوں تھا:

> اگر علماء مسلم لیگ کے ممبر بننا چاہیں تو اُن کو الیکشن کے ذریعے مسلم لیگ کی بااختیار کمیٹیوں میں آنے سے گریز کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ یہ تو بہترین صورت ہے لیکن خاص حالات میں بہت ہی مقتدر علماء کے لیے جو الیکشن کے ذریعے نہ آسکیں، ایک صورت اور بھی ہے جس کو انگریزی میں کو آپشن [co-option] کہتے ہیں۔ یعنی وہ بطریقِ اضافہ آسکتے ہیں۔[1]

"کو آپشن" کے ذریعے کسی عالمِ دین کے لیگ کی کسی کمیٹی میں شامل ہونے کا مطلب بھی یہی تھا کہ لیگ کی منتخب قیادت اُس عالم کو شامل کرے گی۔ یعنی یہ اصول تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا کہ کوئی فرد یا گروہ مذہب کے نام پر لیگ کے مقابلے میں ایک اتھارٹی ہونے کا دعویٰ کرے اور مسلمانوں سے کہے کہ وہ لیگ کے بجائے اُس کی پیروی کریں۔

چنانچہ جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا اور جمعیتہ العلمائے ہند کے جنرل سیکرٹری مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے تمام مسلم جماعتوں کا اجلاس طلب کیا تو قائداعظم نے صاف انکار کر دیا۔ جمعیتہ العلماء نے یہ تجویز اپریل ۱۹۴۷ء میں پیش کی تھی اور دلیل یہ دی تھی کہ تمام مسلم جماعتوں کی مشاورت کے بغیر کسی جماعت کا فیصلہ شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ قائداعظم نے اس کے جواب میں یہ بیان جاری کیا کہ اسلام نے جس مشاورت اور اتحاد کا درس دیا ہے وہ صرف مسلم لیگ کے پلیٹ فارم ہی پر ممکن ہے۔ جو علمائے کرام اب تک لیگ میں شامل نہیں ہوئے اُنہیں اب ضرور شامل ہو جانا

[1] احمد سعید، مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریکِ آزادی، ص ۱۰۸، ۱۱۹۔ احمد سعید نے افاداتِ اشرفیہ در مسائل سیاسیہ، ص ۵۳، ۶۴ سے مولانا تھانوی کے گیارہ سوالات اور لیگ کے جوابات نقل کیے ہیں۔

چاہیے، ”اِس لیے میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہُوں کہ مزید کسی تاخیر کے بغیر مسلم لیگ میں شامل ہو جایئے۔“[1]

پاکستان کے پہلے دونوں وزرائے اعظم یعنی لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین بھی اِسی موقف پر قائم رہے۔ مثلاً لیاقت علی خاں نے فروری ۱۹۴۹ء میں پاکستان مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> جب تک ہم یا ہم میں سے کوئی بھی زندہ ہے ہمیں وہ عہد نہیں بھولنا چاہیے جس کے لیے مسلمانوں نے اِتنی بڑی قربانی دی۔ لیکن وہ عہد پورا نہیں ہو سکتا اگر پاکستان میں ایک ایسی سیاسی تنظیم نہ ہو جو کہہ سکے کہ اسلام کیا ہے اور وہ کون سے اصول ہیں جن کے مطابق اِس ریاست کو عمل کرنا ہے۔ یہ کام صرف مسلم لیگ ہی کر سکتی ہے۔[2]

یہاں لیاقت علی خاں جس عہد کا ذکر کر رہے ہیں وہ مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری کا حلف ہے جو اپریل ۱۹۴۶ء میں قائداعظم سمیت تمام منتخب نمایندوں نے اُٹھایا اور اُس کے بعد قائداعظم نے برصغیر کے تمام مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ بھی یہی حلف اُٹھائیں۔ اِس کی تفصیل آزادی میں بیان کی جا چکی ہے اور مختصر اعادہ ابھی آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے اصل بات سمجھ لیجیے کہ یہاں لیاقت علی خاں یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آپ اور ہم یہ فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں کہ پاکستان میں اسلام کی کون سی تشریح رائج کی جائے کیونکہ یہ فیصلہ پاکستان بنانے سے پہلے ہو گیا تھا۔ اُس فیصلے کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کیں اور اب یہ وطن ہمارے پاس محض اُن شہدا کی امانت

---

[1] Yusufi, *op. cit.,* p.2541

[2] M. Rafique Afzal (ed.), *Speeches and Statements of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan (1941-51),* p. 208

کے طور پر موجود ہے:

اِس وطن کی مٹی میں خون ہے شہیدوں کا
ارضِ پاک مرقد ہے قوم کی اُمیدوں کا
نظم و ضبط کو اپنا میرِ کارواں جانو
وقت کے اندھیروں میں اپنا آپ پہچانو

(کلیم عثمانی)

*

اب اِس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جانا چاہیے کہ جس طرح ایران، سعودی عرب، ترکی اور دُوسرے مسلمان ممالک میں اسلام کی الگ الگ تشریحات رائج ہیں اگرچہ اصول ایک ہیں، اُسی طرح ریاستِ پاکستان اِس مقصد کے لیے قائم ہوئی تھی کہ یہاں اسلام کی وہی تشریح نافذ ہو گی جو مسلم لیگ کے علمی اور فکری سرمائے میں موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کی دینی حیثیت کے حق میں تین اہم دلائل موجود تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ دلائل اب بھی موجود ہیں کیونکہ اگرچہ مسلم لیگ عملاً ختم ہو چکی ہے لیکن اُس کا فکری سرمایہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ جو دلائل ۱۹۵۳ء تک ایک زندہ مسلم لیگ کی دینی حیثیت ثابت کرتے تھے آج اُنہی دلائل کی بنیاد پر ہم مسلم لیگ کے ورثے سے دینی رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ اسلام میں دین اور سیاست کی علیحدگی کا تصوّر موجود نہیں ہے۔ اِس لیے جب تمام مسلمانوں نے ایک تنظیم بنا کر اُس پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا تو ظاہر ہے کہ اُس تنظیم کو صرف سیاسی نہیں بلکہ دینی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔

دُوسری بات یہ ہے کہ خواہ علمائے کرام کی اکثریت کانگرس کے ساتھ رہی ہو لیکن

لیگ میں کئی مکاتبِ فکر کے علمائے کرام بہر حال شامل تھے۔ اِس لیے لیگ کے فکری اور علمی ورثے کی تشکیل میں اُن کی بصیرت نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔

تیسری اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں آل انڈیا مسلم لیگ واحد سیاسی قوّت تھی جس نے پورے برصغیر کے مسلمانوں کو متحد کر دیا۔ ورنہ محمد بن قاسم بھی بعض دوسرے مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے یہاں آیا تھا، مغل بھی خطے کی دوسری مسلم ریاستوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہے تھے اور سلطان ٹیپو کو بھی نظام دکن کے خلاف جنگیں لڑنا پڑی تھیں۔ غرض کہ برصغیر کے مسلمان ہر دَور میں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار رہے تھے۔ یہ صرف اور صرف مسلم لیگ ہی تھی جس نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے میں پورے برصغیر کے مسلمانوں کو اِس طرح متحد کر دیا کہ جن مسلمانوں کو ہمیشہ بھارت ہی میں رہنا تھا وہ بھی دُور دراز کے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کی آزادی کے لیے اپنی اولادوں کا مستقبل قربان کرنے پر تیار ہو گئے۔

۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں جب مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص نشستوں میں سے مرکز اور بعض صوبوں میں سو فیصد اور مجموعی طور پر پورے برصغیر میں ستاسی فیصد نشستیں حاصل کیں تو وہ محض ایک جمہوری تماشہ نہ تھا۔ بلکہ خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد کے ادوار سے لے کر قیامت کے زمانے تک اسلام کی پوری تاریخ کے مبارک ترین لمحات میں سے ایک لمحہ تھا۔ خدا کے آخری پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اُمت کا سب سے بڑا حصہ جو برصغیر کے مسلمانوں پر مشتمل تھا ایک پرچم تلے متحد تھا اور یکزبان ہو کر خدا سے کہہ رہا تھا، ”اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کفار کی قوم

کے خلاف ہماری مدد فرما!"[1]

اقبال کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی تھی:

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفَس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اِس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
پھر دِلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

اُس موقع پر قائداعظم نے بالکل درست کہا کہ "وہ چند مسلمان جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں... ان کے وجود سے فرق نہیں پڑتا، لیکن کم سے کم اب وہ خاموش رہیں... میں اِس پلیٹ فارم سے بلاخوفِ تردید کہتا ہوں کہ مسلم ہندوستان ایک ہے۔"[2]

واقعی! جو مسلمان اُمتِ محمدیؐ کے اتحاد کے اِس نظارے کو دیکھ کر بھی سچے عشق کے اثر سے بیخود نہ ہو جاتا اُس کے حق میں دعائے مغفرت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا تھا!

آج بھی اگر آپ کے ذہن میں بھی اُس اتحاد کا تصوّر کرنے کے باوجود مسلم لیگ کی دینی حیثیت کے بارے میں شکوک و شبہات موجود رہتے ہیں تو آپ خود اپنے حق میں خدا سے دعا کر لیجیے۔ آپ کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی اور دلیل کم سے کم اسلام کے خزانے سے تو شاید دستیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ رسولِ اکرمؐ کی ایک حدیث، جسے علامہ اقبال ایک ٹھوس آفاقی حقیقت کے طور پر دُہرایا کرتے تھے، کچھ اِس طرح ہے کہ "میری اُمت کا

---

[1] Syed Sharifuddin Pirzada (2008), *AIML Centenary Souvenir*, p.338

[2] *Ibid.*, p.339

اتحاد حتمی دلیل ہے“[اتحادِ اُمتی حجۃ قاطعۃ][1]۔

اِس سے آگے حدِ ادب ہے۔

[1] علامہ اقبال کی تقریر ۳/ جولائی ۱۹۳۱ء؛ افضل، گفتارِ اقبال، ص ۱۲۵-۱۲۳۔ انقلاب ۵/ جون ۱۹۳۱؛ افضل، گفتارِ اقبال، ص ۱۲۲-۱۲۳۔ سالک کا کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۴/ جون ۱۹۳۱؛ فاروقی، مخفی گوشے، ص ۲۴۰۔ *Light*, 8 June 1931; Shaheen, *Mementos,* pp.10-11

باب ۴

سنہرے سال

پچھلے ابواب کی روشنی میں ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان کی اصل بدنصیبی، جس کی وجہ سے یہ ریاست اپنی اصل منزل سے بیخبر ہو گئی، یہی تھی کہ پاکستان بنانے والی مسلم لیگ کو اِس ملک پر صرف ساڑھے چھ برس حکومت کرنے کی مہلت ملی۔

جیسا کہ آزادی میں ذکر ہو چکا ہے، ۱۵ اگست کو قائداعظم محمد علی جناح نے گورنر جنرل اور لیاقت علی خاں نے وزیر اعظم کے طور پر اپنے عہدے سنبھالے۔

ستمبر ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کے انتقال کے بعد مشرقی بنگال کے ممتاز مسلمان رہنما خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنے۔ ان کا تعلق نواب سلیم اللہ کے خاندان سے تھا اور بیالیس برس پہلے ڈھاکہ کے جس اجلاس میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی اُس میں وہ ایک بچے کے طور پر شریک ہوئے تھے۔ غالباً اُس اجلاس میں شریک ہونے والوں میں سے اب وہ آخری آدمی تھے۔

اکتوبر ۱۹۵۱ء میں جب لیاقت علی خاں ایک جلسہ ٔعام میں ایک قاتل کی گولی کے شکار ہو کر شہید ہو گئے تو خواجہ ناظم الدین کو وزیر اعظم بنا دیا گیا اور بیوروکریسی سے تعلق رکھنے والے ایک وزیر غلام محمد نے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے ایک مفاد پرست ٹولے کے ساتھ مل کر خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا اور اپنی مرضی سے ایک اور شخص کو وزیر اعظم بنا دیا۔

اگرچہ نئے وزیراعظم کو بھی مسلم لیگ کے ساتھ نتھی کیا گیا لیکن اب لیگ اپنی حیثیت کھو بیٹھی تھی اور کچھ عرصے بعد بالکل ہی ختم ہو گئی۔

غلام محمد اور اُن کے ٹولے نے پاکستان کی پوری آئیڈیالوجی تبدیل کر کے رکھ دی۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۳ء کو وہ مقام سمجھنا چاہیے جب اصل مسلم لیگ ختم ہو گئی اور پاکستانی حکومت بھی اپنی بنیاد سے ہٹ گئی۔

یہ اِس لیے ممکن ہُوا کہ قیامِ پاکستان کے بعد تعلیم یافتہ طبقے نے مسلم لیگ کی طرف توجہ نہیں دی۔ کسی نے لیگ کے مقابلے پر کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت بنائی۔ کسی نے ادب اور تعلیم کے شعبے پر قبضہ کر کے لیگی تصوّرات کے برعکس کسی دوسرے نظریے کو رائج کر دیا۔ کسی نے اپنی سوچ کو ذاتی مفادات تک محدود کر دیا۔

ان سب نے مسلم لیگ پر الزامات کی بوچھاڑ کر کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس جماعت کی طرف سے بدظن کر دیا۔ یہ الزامات آج تک پاکستان کی فضا میں گونج رہے ہیں۔ اس لیے ہم میں یہ کہنے کی اخلاقی جرأت باقی نہیں رہی ہے کہ پاکستان کے پہلے ساڑھے چھ برس، جب پاکستان پر اصلی لیگ کی حکومت تھی، ہماری تاریخ کے سنہرے سال تھے۔

یہاں اُن سنہرے سالوں کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی تمام الزامات کے جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ وہ سب کچھ میری دوسری تصنیفات اور میرے یوٹیوب چینل کی ویڈیوز میں موجود ہے۔

یہاں صرف ایک بات واضح کرنی ہے جس کا براہِ راست تعلق اِس کتاب کے موضوع سے بھی ہے اور ہماری موجودہ زندگیوں سے بھی!

وہ بات یہ ہے کہ جب ایک گروہ کوئی نئی ریاست قائم کرتا ہے تو اُس گروہ کی

کارکردگی کو سب سے پہلے صرف ایک ہی پیمانے سے جانچا جاتا ہے۔ وہ پیمانہ یہی ہے کہ اُس گروہ کی قائم کی ہوئی نئی ریاست قائم رہ سکی یا نہیں۔

پاکستان کی بانی جماعت کے ساڑھے چھ سالہ دَورِ حکومت کو سنہرے سال قرار دینے کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ پاکستان آج تک قائم ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں دو ٹکڑے ہونے کے بعد بھی اِس کے دونوں ٹکڑے آزاد رہے اور اُن میں سے کوئی بھی واپس بھارت میں ضم نہیں ہُوا۔ حالانکہ ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے وقت بھارت کی دونوں بڑی جماعتوں یعنی کانگریس اور ہندو مہاسبھا نے عہد کیا تھا کہ وہ پاکستانی علاقوں کو واپس بھارت میں شامل کر کے ہی دم لیں گے (ان دونوں جماعتوں کی جون ۱۹۴۷ء کی قراردادیں کتاب آزادی میں پیش کی جا چکی ہیں اور آگے دوبارہ ان کے حوالے پیش کر دیئے جائیں گے)۔

اگر ہم دورِ جدید کی دوسری ریاستوں کی طرف نظر ڈالیں جو پاکستان سے پہلے یا اس کے بعد قائم ہوئیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ مسلم لیگ نے اپنی بنائی ہوئی ریاست کو قائم رکھنے میں بعض بڑی طاقتوں سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔

۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس کے ذریعے فرانس کو بادشاہت سے نجات دلائی گئی۔ نئی جمہوری ریاست کو قائم رکھنے کے لیے پندرہ بیس ہزار لوگوں کے سرعام گلے کاٹے گئے۔ دوسری سزائیں اس کے علاوہ تھیں۔ اس کے باوجود صرف پندرہ برس قائم رہنے کے بعد جمہوری فرانس واپس بادشاہت کی آغوش میں چلا گیا۔

۱۹۱۷ء میں روس میں اشتراکی یعنی کمیونسٹ انقلاب آیا (جسے بالشویک بھی کہتے تھے)۔ نئی ریاست قائم کرنے والی کمیونسٹ حکومت نے کم از کم پچاس ہزار شہریوں کو سزائے موت دی (بعض مؤرخین مرنے والوں کی تعداد بارہ لاکھ بتاتے ہیں)۔ دنیا میں

ایک سپر پاور بن جانے کے باوجود وہ ریاست صرف چوہتر (۷۴) برس بعد ۱۹۹۰ء میں ختم ہو گئی جبکہ پاکستان کے قیام کو اُناسی (۷۹) برس ہو چکے ہیں اور:

جب تک ہے یہ دنیا باقی، ہم دیکھیں آزاد تجھے

اب ذرا اُن مسلم ریاستوں پر نظر ڈالیے جو پاکستان کے قیام کے وقت موجود تھیں یا اُس کے کچھ عرصے بعد وجود میں آئیں۔

آپ دیکھیں گے کہ جب ۱۹۵۳ء میں پاکستان میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت برطرف کیا گیا، اُس کے آس پاس کے برسوں میں بہت سی مسلم ریاستوں میں بھی حکومتوں کے تختے الٹے گئے۔ لیکن پاکستان اور اُن کے ریاستوں کے درمیان یہ واضح فرق ہے کہ پاکستان میں کسی بھی قسم کی آمریت دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں چل سکی، اور تمام آمریتوں کے بعد بھی ریاست کے تمام ادارے اور سیاستداں ریاست کے اصل بانیوں کی عزت کرنے پر مجبور ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں اسے بنایا تھا، خواہ وہ عزت جھوٹے دل سے ہی کی جاتی ہو۔ ملک میں تین دفعہ آئین تبدیل ہوا لیکن پاکستان بنانے والوں کی طرف سے ۱۹۴۹ء میں منظور کی جانے والی قراردادِ مقاصد ہر آئین کی بنیاد رہی اور آج بھی ہے۔

دوسری طرف پاکستان میں خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے چند ماہ بعد اگست ۱۹۵۳ء میں ایران میں بھی وزیر اعظم مصدق کی جمہوری حکومت کو ختم کیا گیا۔ لیکن وہاں اقتدار میں آنے والے محمد رضا شاہ پہلوی چھبیس برس تک مطلق العنان بادشاہ بنے رہے اور جب ۱۹۷۹ء میں اُن کی حکومت ختم ہوئی تو ۱۹۵۳ء والی بنیادوں کی طرف واپس جانے کے بجائے ایک نیا نظام قائم ہو گیا (جو ابھی تک قائم ہے)۔ یعنی ایران اپنی اُن جمہوری بنیادوں کی طرف واپس نہیں جا سکا جو ۱۹۵۳ء سے پہلے وہاں موجود تھیں۔ بالکل اسی طرح کی

کہانیاں آپ کو مصر، لیبیا، عراق اور بعض دوسرے ممالک میں نظر آئیں گی۔

ان سب کے برخلاف پاکستان آج بھی اپنی اُس بنیاد کو تسلیم کرتا ہے جو ۱۹۴۷ء میں رکھی گئی تھی۔ کسی حکمراں کو مجال نہیں کہ وہ اُس بنیاد سے انکار کر دے۔ یہی پاکستان بنانے والی جماعت کے ساڑھے چھ سالہ دَورِ حکومت کی کامیابی ہے:

کہتاہے زمانے سے یہ درویشِ جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تُو بھی اُدھر جا!
ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہُوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا!
مَیں کشتی و ملّاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہُوا دریا ہے اگر تُو تو اُتر جا!
توڑا نہیں جادُو مِری تکبیر نے تیرا؟
ہے تجھ میں مُکر جانے کی جرأت تو مُکر جا!

(اقبال)[1]

*

اِس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مسلم لیگ نے اپنی نئی ریاست کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے دَورِ جدید کی کسی بھی بڑی ریاست کے مقابلے میں بہت کم سختی سے کام لیا۔ فرانس اور رُوس میں انقلاب لانے والی جماعتوں نے جتنے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو اپنے خاص حکم کے تحت سزائے موت دی اُس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے

[1] اقبال، ضربِ کلیم، ص ۳۶

کہ دورِ جدید میں شاید ہی کوئی ریاست ہو جس نے اپنے قیام کے ابتدائی برسوں میں اپنے اپ کو مستحکم کرنے کے لیے اپنے بعض مخالفین کو سزائے موت نہ دی ہو۔

۱۹۲۳ء کی دہائی میں ترک جمہوریہ کے قیام کے بعد وہاں ہزار ڈیڑھ ہزار افراد کو ریاست کے خلاف بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ ۱۹۷۹ء میں جب ایران میں اسلامی انقلاب آیا تو پہلے ایک دو برسوں ہی میں تقریباً تین ہزار افراد کو موت کی سزا دی گئی اور اگلے چند برسوں میں یہ تعداد تیس ہزار کے قریب جا پہنچی۔

عوامی جمہوریہ چین ۱۹۴۹ء میں یعنی قیامِ پاکستان کے صرف دو برس بعد وجود میں آیا۔ اگلے چار برسوں میں حکومت کے اپنے بیان کے مطابق تقریباً سات لاکھ بارہ ہزار افراد کو نظریاتی بنیادوں پر سزائے موت مل چکی تھی (جدید موٴرخین کے نزدیک یہ تعداد دس بیس لاکھ تک پہنچتی ہے)۔

اُس زمانے میں برطانیہ اور امریکہ دنیا کی مستحکم ترین ریاستوں میں شمار ہوتے تھے لیکن وہاں بھی بعض ایسے افراد کو اِس الزام کے تحت سزائے موت دی جا رہی تھی کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران دشمنوں کی طرفداری کی یا اُس کے بعد سوویت یونین کی حمایت میں اپنے ملک کے خلاف کام کیا۔

خود بھارت میں، جس نے پاکستان کے ساتھ ہی آزادی حاصل کی تھی، ابتدائی چند برسوں میں بعض افراد کو ریاست کے خلاف بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ جبکہ ریاست کے خلاف بغاوت کرنے والوں پر پولیس اور فوج نے بے دریغ گولیاں چلائیں جن میں مرنے والوں کی تعداد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں میں پہنچتی ہے۔ صرف ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب بھارت نے حیدرآباد دکن پر حملہ کر کے اُس ریاست پر قبضہ کیا تو اُس حملے میں مرنے والوں کی تعداد بھارتی حکومت کی اپنی مرتب کی ہوئی رپورٹ کے

مطابق تیس چالیس ہزار جبکہ موٴرخین کے مطابق تقریباً دولاکھ کے قریب ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ ان تمام جدید ریاستوں کے مقابلے میں پاکستان کی مسلم لیگی حکومت نے کتنے لوگوں کو بغاوت کرنے یا نظریاتی اختلاف رکھنے کی وجہ سے پھانسی دی؟

جواب حیرت انگیز ہے۔ یہاں کسی ایک شخص کو بھی اِس جرم میں موت کی سزا نہیں دی گئی۔

اِس میں شبہے کی گنجائش نہیں کہ پاکستانی ریاست اپنے ابتدائی برسوں میں اُن تمام ریاستوں سے زیادہ مخدوش حالت میں تھی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ فسادات اور قتل و غارت، لاکھوں افراد کی ہجرت، خالی خزانہ اور بھارت کی طرف سے واضح اعلان کہ وہ پاکستان کو ختم کیے بغیر چین سے نہ بیٹھے گا! سرحدی صوبے (موجودہ خیبر پختونخوا) میں عبدالغفار خاں اور بلوچستان میں خان قلات جیسے بااثر رہنماؤں کی طرف سے علیحدگی کے اعلانات! ساری دنیا کے میڈیا میں یہ چرچے کہ پاکستان بس ایک آدھ برس کے لیے بنا ہے اور جناح کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا!

دورِ جدید کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ ایک اِتنی وسیع ریاست کو اپنے قیام کے وقت اِن تمام مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو اور اُس پر بھی وہاں کی حکومت نے کسی ایک شخص کو بھی نظریاتی بنیادوں پر سزائے موت نہ دی ہو۔

پاکستان کے مخالفین زیادہ سے زیادہ صرف یہی اعتراض کرتے ہیں کہ بعض مواقع پر پاکستان سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے والوں کے خلاف پولیس نے سختی سے کام لیا اور ہنگامی ایکشن کے دوران گولیاں لگنے سے ریاست کے بعض مخالفین ہلاک ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریباً ہر بین الاقوامی قانون اور نظریہ ایک نئی ریاست کو ضروری حالات میں اِس سے بھی زیادہ سخت اقدامات کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ بعض صورتوں میں انہیں

ریاست کا فرض قرار دیتا ہے۔

چنانچہ مسلم لیگ کا اپنے ساڑھے چھ سالہ دَورِ حکومت میں کسی ایک بھی شہری کو نظریاتی بنیادوں پر سزائے موت نہ دے کر بھی پاکستان کے وجود کو مستقل بنا دینا ایک ایسی کرامت ہے جو کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے (ورنہ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہوتیں، جو موجود نہیں ہیں)۔

یہ بھی اُسی بات کا ایک ثبوت ہے جو ہم نے پہلے کہی تھی کہ مسلم لیگ در حقیقت برصغیر کی مسلمان قوم ہی کا ایک دُوسرا نام تھی۔ اِس لحاظ سے مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کو مومن کی وہ فراست سمجھنا پڑتا ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ خدا کے نُور سے دیکھتا ہے۔[1]

اِس لیے اب ہم دیکھیں گے کہ اِس فراست سے یعنی مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے استفادہ کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تاکہ ہم پاکستان کی تاریخ کو اُسی فراست سے دیکھیں اور یہی اِس کتاب کا اصل موضوع بھی ہے:

تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اِشارا

(اقبال)[2]

[1] اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ۔ یہ حدیث سنن الترمذی سمیت کئی کتب میں موجود ہے۔ اگرچہ اِسے بعض محدثین نے ضعیف اور بعض نے حسن قرار دیا ہے لیکن اِس کے مفہوم کو عام طور پر قبول کیا گیا ہے۔

[2] اقبال، 'بڈھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو'، ارمغانِ حجاز، ص ۲۳۱

باب ۵

مسلم لیگ کا علمی اثاثہ

اِس کتاب میں پاکستان کی تاریخ کو مسلم لیگ کے جس فکری سرمائے کی روشنی میں دیکھا جائے گا اُسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱ لیگی تحریریں: سب سے پہلے مسلم لیگ کا اپنا لٹریچر ہے جس میں ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء کے عرصے کے سالانہ اجلاسوں کی کاروائیاں اور لیگ کے معتبر رہنماؤں بشمول اقبال، جناح اور لیاقت علی خاں کی تقاریر و خطبات اور کچھ دوسرا مواد شامل ہے۔ یہ پورے برصغیر کے مسلمانوں کے بہترین دماغوں کے چالیس سالہ غور و فکر اور باہمی مشاورت کا نتیجہ ہے جس میں تقریباً ہر مکتبِ فکر نے حصہ لیا یہاں تک کہ علمائے کرام نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

۲ دوسرے فریقوں کا ورثہ: ظاہر ہے کہ مسلم لیگ ہَوا میں تلوار نہیں چلارہی تھی۔ اُس نے دُوسرے فریقوں بالخصوص برطانوی پارلیمنٹ، برطانوی حکومتِ ہند اور ۱۹۱۸ء سے پہلے کی انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ معاہدے بھی کیے اور اُن کے ساتھ مل کر سیاسی پروگرام بھی ترتیب دیئے۔ چنانچہ اُن تمام طاقتوں اور جماعتوں کا سیاسی ورثہ بھی اُس حد تک مسلم لیگ کے اپنے ورثے میں شامل ہے جس حد تک وہ مسلم قومیت کے مسلم لیگی تصوّر کے ساتھ متصادم نہ ہو۔ دُوسری قوموں کے ان رہنماؤں میں سے انیسویں صدی کے انگریز لبرل سیاستداں جان

برائٹ اور بنگال کے عظیم ہندو رہنما چت رنجن داس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کیونکہ لیگی رہنما ان کے حوالے دیتے نہ تھکتے تھے۔

۳ مسلم نشاۃ الثانیہ: یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ لیگ ایک بہت بڑی ثقافتی تحریک کے بطن سے پیدا ہوئی تھی جسے عرفِ عام میں تحریکِ علیگڑھ کہا جاتا ہے لیکن جو حقیقتاً برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ تھی۔ اُس پوری نشاۃ الثانیہ کا سرمایہ جو سینکڑوں بلکہ شاید ہزاروں افراد کے تخلیق کیے ہوئے علم و ادب پر مشتمل ہے، مسلم لیگ کے علمی اور فکری سرمائے کا تیسرا اہم حصہ ہے۔ قائداعظم کے مطابق اِس معاملے میں علامہ اقبال ایک مرکزی حوالے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قائد کے الفاظ میں، "ہر تحریک کا ایک فلسفی ہوتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے قومی نشاۃ الثانیہ کے فلسفی اقبال ہیں۔"

۴ عالمی ادب و دانش: جب علیگڑھ تحریک یعنی برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کو لیگ کے اثاثے کا حصہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر دنیا بھر کے قدیم اور جدید علوم اِس شرط کے ساتھ لیگ کے ورثے میں داخل ہو جاتے ہیں کہ ہم اُنہیں مسلم نشاۃ الثانیہ کے اکابرین اور بالخصوص علامہ اقبال کی نظر سے دیکھیں گے۔ یعنی بابل اور نینوا کی کھدائی میں برآمد ہونے والے آثارِ قدیمہ سے لے کر دورِ حاضر میں سامنے آنے والی مصنوعی ذہانت تک کسی بھی انسانی علم کے بارے میں ہم مغرب کے سماجی علوم کے ماہرین کی رائے کو اہمیت دینے پر مجبور نہیں ہیں بلکہ ہم تمام انسانی علوم کو اُس نقطۂ نظر سے دیکھیں گے جو علامہ اقبال اور اُن کے مکتبِ فکر نے قائم کر دیا۔ کسی بھی علم کو اُس نقطۂ نظر سے دیکھنا "مسلم لیگ کا نقطۂ نظر" ہی کہلائے گا۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، مسلم لیگ اور برصغیر کی

ملّتِ اسلامہ ایک ہی وجود کے دو نام ہیں۔ یہ لیگ کے علمی اور فکری اثاثے کا چوتھا حصہ ہے، جسے اِس کتاب میں بھی استعمال کیا جائے گا۔

۵ عوام کے ضمیر: لیگ کے اثاثے کا پانچواں اور آخری حصہ شاید آپ کو سب سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہو کیونکہ اِسی حصے کو پہچاننے میں ناکامی کی وجہ سے ہم لیگ کی اہمیت اور خود اپنی حقیقت کو پہچاننے میں ناکام رہے ہیں۔ یہ حصہ اُن تمام دِلوں پر مبنی ہے جو پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے ان پڑھ اور غریب مسلمانوں کے سینوں میں دھڑکتے ہیں:

سمجھا لہُو کی بوند اگر تُو اُسے تو خیر
دِل آدمی کا ہے فقط اِک جذبۂ بلند
گردش مہ و ستارہ کی ہے ناگوار اُسے
دل آپ اپنے شام و سحَر کا ہے نقش بند

(اقبال)[1]

مسلم لیگ کے ذمہ دار رہنماؤں نے ہر موقع پر اِصرار کیا کہ اُن کی ہر پالیسی اور ہر خیال مسلمان عوام کے دلوں سے اخذ کی گئی ہے۔ تفصیلات آزادی میں پیش کی جاچکی ہیں لیکن آپ کی دلچسپی کے لیے ایک مثال دہرائی جاسکتی اور وہ یہ ہے کہ جب قائداعظم سے پوچھا گیا کہ تصوّرِ پاکستان کا خالق کون ہے تو اُنہوں نے جواب دیا، ''ہر مسلمان!''[2]

یہ درست ہے کہ پاکستان کا تصوّر اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں پیش کیا تھا لیکن

---

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۶۳

[2] Jinnah, 8 March 1941, Yusufi, *op. cit.,* p.1841

دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اُنھوں نے بھی اُس خطبے میں یہی کہا تھا کہ وہ صرف مسلمانوں کے ذہنوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔[1] آزادی میں آپ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ لیگ کے معتبر رہنما، بالخصوص اقبال اور قائداعظم، پڑھے لکھے مسلمانوں کے مقابلے میں اَن پڑھ غریب مسلمانوں کو زیادہ باشعور سمجھتے تھے اور اُن کی بصیرت پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔

زیرِ نظر کتاب کے لیے لیگ کے اثاثے کے اِس پانچویں حصے یعنی اَن پڑھ غریب انسان کی بصیرت اور شعور کے دو پہلو زیادہ اہم ہیں۔

اول یہ کہ اگر لیگ کا تمام علمی اور فکری اثاثہ ضائع بھی ہو جائے تو اُسے پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے غریب مسلمانوں کے ضمیر سے دوبارہ برآمد کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پہلے بھی یہ تمام فکر و فہم وہیں سے آئی تھی۔

دوم یہ کہ اگرچہ ۱۹۵۳ء میں اصل مسلم لیگ بظاہر ختم ہو گئی لیکن اِس خطے کے غریب مسلمانوں کے ضمیر میں وہ ہمیشہ زندہ رہی ہے اور اِنہی کے ذریعے اُس لیگ کا "نقطۂ نظر" بھی اپنے آپ کو مسلسل ظاہر کرتا رہا ہے اگرچہ ہم اُسے پہچاننے میں ناکام رہے ہیں:

ہے خون اُسی کا گرمِ سفر ہر راہِ وفا کے سینے میں
تصویر اُسی کی ہنستی ہے اِس بزم کے ہر آئینے میں
تعبیر کے سانچے میں جس نے ہر خواب کی صورت ڈھالی ہے

(کلیم عثمانی)

پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے غریب مسلمانوں کے ضمیر کی آواز کو پہچاننے کے لیے جس "پاسوَرڈ" (password) کی ضرورت ہے، اُس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ یہ وہ عہد ہے جو

[1] Sherwani, *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*, p.9

اپریل ۱۹۴۶ء میں برصغیر کے مسلمانوں نے کیا تھا۔

قرآن شریف میں خدا نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے، "میری نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمہیں عطا کی اور وہ عہد پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا، میں وہ عہد پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔ اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔"[1]

تاریخ کی روشنی میں یوں دکھائی دیتا ہے جیسے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک ایسی ہی نعمت وہ اتحاد تھا جو خدا نے اُنہیں مسلم لیگ کے ذریعے عطا فرمایا۔ اور اُس اتحاد کی گھڑی میں انہوں نے، اپریل ۱۹۴۶ء میں، جو حلف اٹھایا وہ ایک ایسا ہی عہد نامہ تھا کہ وہ اُسے پورا کریں تو خدا اُن کے ساتھ اپنا عہد پورا کر دے گا۔

آیئے اِس بات کو جدید علم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ درحقیقت یہی ایک نکتہ اِس کتاب میں پیش کی جانے والی پوری تاریخ کا "پاسوَرڈ" (password) ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ، آیت ۴۰: یَابَنِی إِسْرَائِیلَ اذْکُرُوا نِعْمَتِیَ الَّتِی أَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِی أُوفِ بِعَهْدِکُمْ وَإِیَّایَ فَارْهَبُونِ

باب ۶

ہمارا عمرانی معاہدہ

آپ نے سیاسی اور عدالتی بیانات میں شاید "سوشل کانٹریکٹ" (social contract) کے الفاظ سنے ہوں جن کا اُردو ترجمہ "عمرانی معاہدہ" ہے، جسے بعض اوقات "سماجی معاہدہ" بھی کہا جاتا ہے۔

سیدھے سادے الفاظ میں اِس کا مطلب وہ معاہدہ ہے جو ریاست کے شہریوں کے درمیان طے پایا ہو تاکہ ریاست وجود میں آ سکے۔ لیکن اصل میں یہ اصطلاح آج سے تین چار سو سال پہلے تین بڑے فلسفیوں نے پیش کی تھی جن کے نام ٹامس ہابز، جان لاک اور ژاں ژاک رُوسو (Thomas Hobbes, John Locke, Jean-Jacques Rousseau) ہیں۔

ان تینوں میں سے رُوسو، جس کا تعلق فرانس سے تھا، سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اقبال کے مطابق وہ جدید سیاسی فکر کا حقیقی بانی بھی ہے اور اُس کے خیالات اسلام سے بہت قریب بھی ہیں۔ اُس کی سب سے اہم کتاب عمرانی معاہدہ (*The Social Contract*) میں پیغمبرِ اسلامؐ اور خلفائے راشدینؓ کے بارے میں جو رائے پیش کی گئی ہے اُسے سیاق و سباق میں پڑھا جائے تو مطلب یہی نکلتا ہے کہ صرف اسلام کے اصل اصول ہی ایک ایسی بنیاد ہیں جن پر دورِ جدید میں ایک کامیاب سیاسی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

رُوسو کے مطابق ایک ریاست خواہ جیسے بھی حالات کے تحت وجود میں آئی ہو، اُس کی

اصل بنیاد اُس کے شہریوں کے درمیان ایک مخصوص روحانی قسم کے سمجھوتے پر ہوتی ہے۔ وہ سمجھوتہ صرف یہی ہوتا ہے کہ اگر ریاست کے تمام افراد مل کر کوئی فیصلہ کریں گے تو اُس فیصلے کی اطاعت ریاست کے ہر فرد پر لازم ہوگی۔ اِس قسم کے فیصلوں کو رُوسو ''جنرل وِل'' (general will) یعنی ''ارادۂ عام'' کہتا ہے۔

سیدھے سادے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ ایک ریاست کی اصل بنیاد اِس بات پر ہوتی ہے کہ ریاست کے تمام شہری اپنے ہی متفقہ فیصلوں کی اطاعت کرنے پر راضی ہو جائیں۔ اِسی سمجھوتے کو رُوسو ''سوشل کانٹریکٹ'' (social contract) کہتا ہے، جسے اُردو میں ''عمرانی معاہدہ'' کہتے ہیں اور بعض لوگ آسانی کے لیے ''سماجی معاہدہ'' بھی کہہ دیتے ہیں۔

رُوسو کے لحاظ سے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ریاست میں رہنے والا ہر شخص واقعی اِس عمرانی معاہدے میں شریک ہو۔ اگر کچھ لوگوں نے بھی اتفاقِ رائے (یعنی جنرل وِل) کی اطاعت کے اصول پر ریاست قائم کر دی ہے تو اُس کے بعد جو شخص بھی اُس ریاست میں رہنا پسند کرے گا اُس پر لازم ہو گا کہ وہ بھی اس اصول کی پابندی کرے۔ ورنہ اُسے ریاست میں رہنا ہی نہیں چاہیے۔

چنانچہ رُوسو کے نزدیک عوام، حکومت، ریاست اور سیاسی جماعت کے درمیان کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہ سب ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں اور وہ حقیقت جنرل وِل یعنی اتفاقِ رائے ہے۔ ایک قوم کے اجتماعی ارادے کو ایک زاویے سے دیکھیں تو عوام دکھائی دیں گے، دوسرے زاویے سے دیکھیں تو حکومت دکھائی دے گی۔ ایک طرف سے دیکھنے پر ریاست دکھائی دے گی اور دُوسرے نقطۂ نظر سے سیاسی جماعت کہلائے گی۔ جیسا کہ ہم اِس کتاب میں کہہ رہے ہیں کہ برصغیر کی مسلمان قوم اور مسلم لیگ ایک ہی

حقیقت کے دو نام تھے:

الفاظ کے پیچوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غواص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے!

(اقبال)[1]

اِس لیے رُوسو سیاسی جماعتوں کے وجود کو ریاست کے لیے مضر قرار دیتا ہے اور ہمیں سمجھاتا ہے کہ اگر غور سے دیکھو تو ہر سیاسی جماعت اپنی جگہ ایک الگ ریاست ہی ہوتی ہے۔ اِس کے باوجود رُوسو سیاسی جماعتوں کے وجود پر پابندی لگانے کے حق میں نہیں ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ عوام خود اِتنے باشعور ہو جائیں کہ وہ اپنے اتفاقِ رائے کی اہمیت کو سمجھیں اور سیاسی جماعتوں کے جال میں نہ پھنسیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، قائداعظم اور مسلم لیگی رہنماؤں کا موٴقف بھی یہی تھا۔

زیرِ نظر کتاب میں ہم دیکھیں گے کہ اپریل ۱۹۴۶ء میں برصغیر کے مسلمانوں نے مسلم لیگ سے وفاداری کا جو حلف اٹھایا تھا وہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا عمرانی معاہدہ تھا۔ اُس کی بنیاد پر صرف پاکستان کی ریاست ہی وجود میں نہیں آئی بلکہ موجودہ بھارت اور بنگلہ دیش کی بنیاد بھی وہی حلف ہے اور اُس وقت سے اب تک وجود میں آنے والے تمام عالمی نظاموں یا "ورلڈ آرڈرز" (world orders) بھی کسی نہ کسی لحاظ سے اُسی کی وجہ سے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ لگتا ہے جسے قبول کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تو ہماری اپنی ہی غلامانہ ذہنیت ہے کہ ہم اپنی قوم کے کسی کارنامے کو اِتنا بڑا تسلیم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ بعض جائز سوالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اِس کتاب میں ایسے ٹھوس ثبوت اِتنی آسانی کے ساتھ آپ کے سامنے آتے جائیں گے کہ

---

[1] اقبال، ضربِ کلیم، ص ۳۷

آپ خود ہی اپنے بہت سے سوالات کے جواب حاصل کرنے کے قابل ہو سکیں۔ لیکن اُس کے لیے سب سے پہلے ہمیں اُس حلف کی نوعیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اِس باب کا آخری موضوع یہی ہے۔

*

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات میں کامیاب ہونے والے تمام مسلم لیگی نمایندے ۸-۷ اپریل ۱۹۴۶ء کو دہلی میں جمع ہوئے۔ اُن کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی اور وہ برصغیر کے مختلف صوبوں کے مسلمانوں کی نمایندگی کرتے تھے۔

وہاں ایک "قرارداد ترتیب دی گئی جسے بنگال کے مسلم رہنما حسین شہید سہروردی نے تمام نمایندوں کے سامنے پیش کیا اور سب نے متفقہ طور پر اُسے منظور کر لیا۔ اِس کتاب میں ہم اُسے "مسلم لیگ کی "قرارداد دہلی ۱۹۴۶ء" (اور بعض جگہوں پر صرف "قراردادِ دہلی") کہیں گے۔

اُس قرارداد کے ذریعے دنیا پر واضح کیا گیا کہ برصغیر کی مسلمان قوم کیا چاہتی ہے۔ ہم اسے تین بنیادی نکات میں سمیٹ سکتے ہیں:

الف قرارداد جو سات پیراگرافوں پر مشتمل ہے، اُس کے پہلے پانچ پیراگرافوں میں واضح کیا گیا ہے کہ برصغیر کی مسلمان قوم ایک عظیم تہذیب کی وارث ہے۔

ب چھٹے پیراگراف میں مطالبہ کیا گیا کہ برصغیر کے جن علاقوں میں یہ مسلمان قوم پہلے ہی سے اکثریت میں ہے اور اُن علاقوں کی جغرافیائی نوعیت ایسی ہے کہ انہیں بڑی آسانی سے علیحدہ ریاستیں بنایا جا سکتا ہے، اُنہیں ایک متحدہ ریاست بنا دیا جائے (یہ علاقے تھوڑے سے فرق کے ساتھ وہی تھے جہاں اب پاکستان اور بنگلہ دیش کی ریاستیں قائم ہیں)۔ اِس نئی ریاست کا نام پاکستان

ہو گا۔ باقی برصغیر ہندوستان کہلائے گا (اور یہ موجودہ اِنڈیا یعنی بھارت ہے)۔
دونوں ریاستوں میں تمام مذہبی اقلیتوں کے حقوق اُن کے ساتھ "مشاورت" کے ذریعے طے کیے جائیں گے (عملاً اِس کا مطلب یہی تھا کہ دونوں ریاستوں میں ہر مذہب کے افراد برابر کے شہری ہوں گے لیکن اگر پاکستانی غیر مسلم یا بھارتی مسلمان اپنے اپنے مذہب و ثقافت کے تحفظ کے لیے اضافی حقوق چاہیں تو حاصل کر سکتے ہیں)۔
پاکستان اور ہندوستان دونوں آزاد ریاستیں ہوں گی۔ انگریزوں کو چاہیے کہ وہ دونوں ریاستوں کے لیے علیحدہ دستور ساز اسمبلیاں تشکیل دیں اور تمام اقتدار اُن اسمبلیوں کے حوالے کر کے انہیں آزاد کر دیں۔

ج آخری پیراگراف میں کہا گیا کہ مسلمان ہر حال میں اِس مطالبے کو پورا کروائیں گے اور اِس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔

اُس موقع پر ایک حلف بھی پہلے سے ٹائپ کر کے ہر نمایندے کو دے دیا گیا تھا۔ آغاز اور اختتام پر قرآن شریف کی آیات کا ترجمہ درج تھا، اور حلف میں "پاکستان کے قومی مقصد کے حصول کے لیے" مسلم لیگ کی مکمل اطاعت کرنے کا عہد کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان کا قیام اِس خطے کے تمام لوگوں کے لیے خوشحالی کا سبب بنے گا۔

اجلاس میں لیاقت علی خاں نے یہ حلف پڑھ کر سنایا اور مسلم لیگ کے تمام منتخب ارکان نے، جن میں قائداعظم بھی شامل تھے، یہ حلف اُٹھایا۔ اِس حلف کا مکمل متن بھی ایک ضمیمے کے طور پر کتاب کے آخر میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ کس طرح قراردادِ دہلی اور یہ حلف نہ صرف پاکستان بلکہ بھارت سمیت بعض دوسری ریاستوں کی بنیاد ہیں بلکہ اُس وقت سے اب تک دنیا میں جو بھی عالمی

نظام یا ورلڈ آرڈرز رائج ہوئے ہیں، اُن کی وجہ بھی یہی حلف ہے۔ یہ اِس کتاب کے اگلے باب کا موضوع ہے:

قدرت کے مقاصد کا عیار اُس کے اِرادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان!

(اقبال)[1]

[1] اقبال، ضربِ کلیم، ص ۵۷

حصہ دوم

ہماری تاریخ کے سات مراحل

باب ۷

پہلے تین مراحل

پچھلے باب میں ہم نے اپنی تاریخ کے "پاسوَرڈ" کی نشاندہی کی تھی یعنی ۱۹۴۶ء کی قراردادِ دہلی اور مسلم لیگ سے وفاداری کا حلف۔ دُوسروں کے لیے یہ دستاویز محض ایک سیاسی مطالبہ ہو سکتی ہے جسے قانون سازوں نے ایک کنونشن ہال میں تیار کیا تھا لیکن آل انڈیا مسلم لیگ کے مؤرخ کے لیے یہ اس سے کہیں زیادہ گہری چیز ہے۔ یہ ایک قوم کا "سماجی معاہدہ" ہے۔ اور جب کروڑوں لوگوں کا اجتماعی ارادہ کسی معاہدے پر مہر لگا دیتا ہے تو وہ محض کاغذ کا ٹکڑا نہیں رہتا، بلکہ فطرت کی ایک قوّت میں بدل جاتا ہے۔

تاریخ کو عموماً حکمرانوں، بغاوتوں اور حکومتوں کے ایک بے ترتیب سلسلے کے طور پر پڑھایا جاتا ہے جیسے تاریخ طاقتور لوگوں کے ہاتھوں ہونے والے حادثات کا مجموعہ ہو۔ لیکن لیگی نقطہ نظر سے سیاسی واقعات محض سطح پر اُبھرنے والی لہریں ہیں۔ روزمرہ کی سیاست کے شوروغل کے نیچے ایک عظیم اور بے پرواقوّت کام کررہی ہوتی ہے۔

چنانچہ لیگ کے بڑے رہنما اپنی تاریخ کو ایک بالکل انوکھے انداز میں دیکھتے تھے جس کی کوئی دُوسری مثال ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی قوم کے ایک نئے سفر کو ۱۸۸۷ء سے شروع کر کے بیس بیس برس کے مراحل میں تقسیم کرتے تھے جن کی تفصیل آزادی میں پیش کی جا چکی ہے۔ خلاصہ کچھ یوں ہے:

۱ پہلا مرحلہ—قومی تنظیم،۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۶ء

نواب سلیم اللہ خاں نے مسلم لیگ کے قیام کے موقع پر واضح کیا کہ یہ اُس سفر میں ایک نیا موڑ ہے جو بیس برس پہلے محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس کے قیام کے ساتھ شروع ہُوا تھا (وہ کانفرنس ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علیگڑھ میں قائم کی گئی تھی)۔ اُس کانفرنس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمان جو ایک دُوسرے سے بالکل بیخبر رہتے ہیں اپنے تمام فیصلے آپس میں صلاح مشورے کے ذریعے اتفاقِ رائے کے ساتھ کرنے کے قابل ہو جائیں۔ بیس برس میں یہ مقصد اِتنے مکمل طور پر حاصل ہو گیا کہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ پورے برصغیر کے مسلمانوں سے مشاورت کے بعد اتفاقِ رائے کے ساتھ قائم کی گئی۔

۲ دُوسرا مرحلہ—نمایندگی کا حق،۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۶ء:

لیگ کا سب سے پہلا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے نمایندے منتخب کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ اِسے جداگانہ انتخاب کہتے تھے۔ اگرچہ یہ حق کسی نہ کسی صورت میں ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات میں بھی تسلیم کر لیا گیا لیکن ۱۹۲۶ء کے عام انتخاب پہلا موقع تھے جب عوام نے بھرپور طور پر یہ حق استعمال کیا۔

۳ تیسرا مرحلہ—حقِ حکمرانی،۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۶ء:

مارچ ۱۹۲۷ء میں مسلم رہنماؤں نے ہندوؤں کی طرف سے جداگانہ انتخاب کے خلاف اعتراضات کے جواب میں یہ تجویز پیش کی کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اگر وہاں اُنہیں جمہوری طریقے سے منتخب

حکومتیں بنانے کا موقع فراہم کر دیا جائے تو وہ جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ یہی خیال بالآخر پاکستان کا تصوّر بن گیا۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے عام انتخاب میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا اور اُس ووٹ سے منتخب ہونے والے نمایندوں نے "قراردادِ دہلی منظور کر کے اور مسلم لیگ سے وفاداری کا حلف اُٹھا کر (جس کا تذکرہ پچھلے باب میں ہو چکا ہے)، پاکستان کے قیام کو یقینی بنا دیا۔

تاہم اُس کے بعد بھی کئی ماہ تک مسلم لیگ کو قراردادِ دہلی پر عمل درآمد کروانے کے لیے جدوجہد کرنا پڑی۔ اُس جدوجہد کے نتیجے میں اگلے برس یعنی ۱۹۴۷ء میں برصغیر آزاد ہُوا، اور قراردادِ دہلی کے مطابق یہاں دو ریاستیں قائم کر دی گئیں جو پاکستان (بشمول بنگلہ دیش) اور بھارت تھیں۔

لہٰذا مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے ۱۹۴۷ء میں قومی تاریخ کے چوتھے مرحلے کا آغاز ہُوا اور یہ آزادی کا مرحلہ تھا۔

لیکن یہاں ہمارے سامنے تین بڑے سوال ابھرتے ہیں جن کا جواب دیئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ بدقسمتی سے دنیا بھر کے تمام علوم اُن تینوں میں سے کسی ایک سوال کا جواب دینے سے بھی قاصر ہیں۔ اِس لیے ہمیں اُن کے جوابات صرف مسلم لیگ اور اُس کے نمایندہ فلسفی اقبال کے افکار ہی سے برآمد کرنے پڑیں گے خواہ دنیا کے تمام دانشور اور اُن سے تربیت پانے والا ہمارا اپنا ذہن بھی اُن جوابات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے:

دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد؟
سالکِ رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ!

(اقبال)[1]

وہ مشکل سوالات یہ ہیں:

١ اِن تینوں مراحل میں سے ہر مرحلہ مسلم لیگ کی طرف سے ایک واضح مقصد کے تعین کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور اُس مقصد کے حصول پر ختم ہوتا ہے۔ اِس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلمان ہر لمحے ایک کامیابی سے دُوسری کامیابی کی طرف بڑھ رہے تھے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اُس تمام عرصے میں مسلمان بدحالی کے شکار رہے اور سخت مشکلات سے گزرے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

٢ کیا دنیا کی دُوسری قومیں بھی اُس زمانے میں اِسی قسم کے مراحل سے گزر رہی تھیں؟

٣ آخر ہر مرحلہ بیس برس ہی میں کیوں مکمل ہُوا؟ کیا ہمیں آیندہ تاریخ کو بھی بیس بیس برس کے مراحل میں تقسیم کرنا پڑے گا؟ ایک منطقی ذہن کس طرح اِس پر راضی ہو سکتا ہے؟

آیئے اِن تینوں سوالوں کے جوابات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

*

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ لیگ کے بڑے لیڈروں کا دعویٰ تھا کہ اگر ایک قوم متفقہ طور پر کوئی مطالبہ کرے تو قدرت کے قوانین خود اُس مقصد کو پورا کر دیتے ہیں بشرطیکہ اُس مطالبے میں کسی دوسری قوم کے ساتھ ناانصافی نہ ہو رہی ہو۔ یعنی مطالبہ کرنے والی قوم اپنے لیے بھی صرف وہی حق مانگ رہی ہو جو وہ دُوسروں کو دینے پر تیار ہے۔

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ١٠٤

جدید زمانے میں جمہوریت کی فلسفیانہ بنیاد بھی یہی تھی جسے فرانسیسی مفکر رُوسو نے اپنی تصانیف بالخصوص عمرانی معاہدہ(Social Contract) میں واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ درست ہے کہ آج سے تقریباً ایک سو برس پہلے مغربی دانشوروں نے اِس بنیاد کو چھوڑ دیا کیونکہ پہلی جنگِ عظیم نے اُنہیں اپنے آپ سے مایوس کر دیا تھا۔ لیکن لیگ اِسے کیوں چھوڑتی جبکہ اُسے اِس کی سچائی کے مسلسل ثبوت مل رہے تھے؟

اقبال کے نزدیک تو ویسے بھی یہ عقیدہ ایک مسلمان کے ایمان کا حصہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر کیا گیا ہے، اقبال اُس حدیث کو ایک ٹھوس آفاقی حقیقت سمجھتے تھے جس میں اُمت کے اتحاد کو حتمی دلیل قرار دیا گیا ہے۔

صرف اِس بات سے اندازہ لگا لیجیے کہ جون ۱۹۳۱ء میں لاہور کے مسلمانوں کو مغل پورہ میں واقع ایک انجینئرنگ کالج کے حوالے سے کچھ مسئلہ پیش آیا جس نے اُن میں شدید اضطراب پیدا کیا۔ اقبال نے مسلمانوں کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "تم آج تک اپنی مصیبت کے علاج کے لیے ہزاروں تدبیریں کر چکے ہو، اب ایک تدبیر محمد عربی صلعم کی بھی آزماؤ۔ حضور صلعم فرماتے ہیں 'اتحادُ اُمتی حجۃ قاطعۃ' [میری امت کا اتحاد حتمی دلیل ہے]۔ ایک دفعہ اتحاد کر کے دیکھو۔ اگرچہ اب تک کی تمام تدابیر ناکام ثابت ہو چکی ہیں لیکن حضرت محمد مصطفی صلعم کا بتلایا ہوا یہ نسخۂ شفا کبھی ناکامیاب نہیں ہو گا۔"[1]

چنانچہ لاہور کے مسلمانوں نے اِس نصیحت پر عمل کیا اور اُن کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اُس کامیابی کے موقع پر جو جلسہ منعقد ہُوا اُس میں اقبال نے صاف الفاظ میں کہا:

میں نے عرض کیا تھا کہ مسلمانوں کا اتحاد حضور صلعم کے مطابق برہان قاطع

---

[1] علامہ اقبال کی تقریر ۳/ جولائی ۱۹۳۱ء؛ افضل، گفتار اقبال، ص ۱۲۵-۱۲۳۔ انقلاب ۵/ جون ۱۹۳۱؛ افضل، گفتارِ اقبال، ص ۱۲۲-۱۲۳۔ سالک کا کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۴/ جون ۱۹۳۱؛ فاروقی، مخفی گوشے، ص ۲۴۰۔ *Light*, 8 June 1931; Shaheen, *Mementos,* pp.10-11

ہے۔ آپ نے اس امر میں خلوصِ نیت سے عمل کیا اور اس کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا۔ مسلمانوں کے سامنے عنقریب بہت بڑے امور پیش ہونے والے ہیں جن کا تعلق آپ کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ اسی طرح سے ثابت قدم رہیں...[1]

اب آپ خود ہی سوچیے کہ اگر ۱۸۸۷ء سے ۱۹۴۶ء تک مسلمانوں کے تینوں بڑے مقاصد جن پر مسلمان متفق تھے، ایک ایک کر کے پورے ہوتے گئے تو کیا اقبال کے نقطۂ نظر سے اِس پر کسی حیرت کی گنجائش ہے؟ خود قائداعظم نے اپنے مشہور اصولوں "ایمان، اتحاد، نظم وضبط" (Faith, Unity, Discipline) میں سے "ایمان" کی تشریح اِن الفاظ میں کی تھی کہ "خدا پر ایمان، اپنی قوم پر ایمان اور اپنی قوم کی تقدیر پر ایمان"۔

پوری تحریکِ پاکستان ہی اِس مفروضے کی بنیاد پر چلی تھی کہ تمام مسلمان متفقہ طور پر جو مقصد متعین کریں گے قدرت خود اُسے پورا کرے گی بشرطیکہ اُس میں کسی دوسری قوم کی حق تلفی نہ ہو۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۶ء میں جب لیگی نمایندوں نے "قراردادِ دہلی متفقہ طور پر منظور کی تو قائداعظم نے اُس کا اعلان کرتے ہوئے کہا، "خدا ہمارے ساتھ ہے کیونکہ ہم درست راستے پر ہیں اور ہمارا مطالبہ اِس عظیم برصغیر میں رہنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے مُنصفانہ ہے... میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی طاقت یا حکومت ہمیں ہمارے پاکستان کے عزیز نصبُ العین کو حاصل کرنے سے روک سکتی ہے۔ صرف ایک شرط ہے—اتحاد!"[2]

لہٰذا اگر ساٹھ برس تک مسلمان قوم کے تینوں بڑے اور متفقہ مقاصد حیرت انگیز طور پر پورے ہوتے رہے تو لیگ کے نقطۂ نظر سے اِس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے

---

[1] انقلاب، ۵/جولائی ۱۹۳۱ء؛ افضل، گفتارِ اقبال، ص ۱۲۵-۱۲۳

[2] Mitra, *Indian Annual Register Jan-Jun 1946*, pp.192-199

بلکہ لیگ اِس کے سوا کسی اور بات کی توقع ہی نہیں رکھتی تھی۔

یہ بالکل اِس طرح ہے کہ اگر کسی شخص نے کبھی ہوائی جہاز نہ دیکھا ہو اور اُسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ انسان ہوائی جہاز ایجاد کر چکا ہے تو وہ رَن وے پر کھڑے ہوائی جہاز کو دیکھ کر یقین نہیں کرے گا کہ اِتنی بڑی مشین ہوا میں پرواز کر سکتی ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہوائی جہاز فضا میں بلند بھی ہو جائے تو وہ حیرت ہی میں مبتلا رہے گا۔ لیکن کیا آپ ایک پائلٹ سے توقع کرتے ہیں کہ وہ بھی اُس بیخبر شخص کی حیرت میں شریک ہو جائے؟

مسلم لیگ کے رہنماؤں کو پائلٹ سمجھئے اور دنیا کے جس کسی دانشور نے لیگ کے ورثے سے استفادہ نہیں کیا ہے اُسے وہی بیخبر شخص جانیے جسے معلوم نہیں ہے کہ انسان کیا صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔

اب آیئے اِس اُلجھن کی طرف کہ اگر مسلمان واقعی اُن ساٹھ برسوں میں ایک کامیابی سے دُوسری کامیابی کی طرف بڑھ رہے تھے تو پھر بدحالی کے شکار کیوں تھے؟ بلکہ خود اقبال نے جو "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" جیسی نظموں میں مسلمانوں کی نااتفاقی اور بے بصیرتی پر واویلا کر رکھا ہے، اُسے کس طرح سمجھا جائے؟

جواب اِتنا آسان ہے کہ آسان ہونے کی وجہ سے ہی ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیگ کے تمام بڑے رہنماؤں کے نزدیک مسلمانوں کی تمام مشکلات پڑھے لکھے مسلمانوں کی وجہ سے تھیں۔ اگرچہ وہ تعداد میں اَن پڑھ عوام سے بہت کم تھے لیکن جو کچھ وسائل بھی مسلمانوں کی قسمت میں آتے تھے وہ اِسی پڑھے لکھے طبقے کی جھولی میں چلے جاتے تھے اور قوم کی باگ ڈور بھی مجبوراً پڑھے لکھے طبقے ہی کے ہاتھوں میں تھی جیسا کہ ہمیشہ ہوتی ہے۔ یہ طبقہ کسی بڑی مشکل سے گھبرا کر قوم کے ساتھ متفق تو ہو جاتا تھا جیسا کہ ہر مرحلے کے آغاز پر متفق ہُوا۔ لیکن اُس کے بعد اپنے یقین کی کمی، اپنی زہر آلود تعلیم کے اثرات یا کسی

دنیاوی لالچ کی وجہ سے اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتا تھا۔

سر سیّد کے زمانے سے لے کر قیامِ پاکستان تک لیگ کے ہر معتبر اور ذمے دار رہنما کے بیانات میں یہی بات آپ کے سامنے آتی ہے۔ تفصیل آزادی میں پیش کی جاچکی ہے لیکن دومثالیں یہاں دیکھ لیجیے۔

۱۹۳۲ء میں مسلم لیگ کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور مسلمان کئی سیاسی جماعتوں میں بٹ چکے تھے۔ اُن تمام جماعتوں کے مشترکہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے مشورہ دیا کہ مسلمانوں کی صرف ایک تنظیم ہونی چاہیے (اور اِسی مشورے کے مطابق چند برس بعد مسلم لیگ کو پوری آن بان کے ساتھ دوبارہ فعال بنایا گیا)۔ لیکن یہ مشورہ دینے سے پہلے اُنہوں نے جو الفاظ کہے، اُن پر بھی غور کر لیجیے۔ اُنہوں نے کہا:

> ہمیں بڑی صفائی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیے کہ موجودہ سیاسی جدوجہد میں جن افراد پر مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کی ذمہ داری ہے ان کے سیاسی خیالات میں اب بھی ایک قسم کا انتشار پایا جاتا ہے۔ تاہم اِس صورتِ حال میں قوم کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مسلمان عوام اپنی قوم کے مستقبل کے لیے قربانی دینے کے جذبے میں بالکل پورے ہیں۔۔۔ قصور ہمارا ہے، اُن کا نہیں۔[1]

بالکل اِسی طرح قائداعظم بھی پوری تحریکِ پاکستان کے دوران تعلیم یافتہ مسلمانوں کو احساس دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ عوام بیدار ہیں اور باشعور ہیں اِس لیے اب تعلیم یافتہ طبقے کو بھی ذہنی انتشار سے نکل کر عوام کے ساتھ چلنا چاہیے۔ قیامِ پاکستان کا اعلان ہونے کے بعد گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کے لیے کراچی آنے کے بعد ایک دو روز بعد ہی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا، ”میں نے یہ اکیلے حاصل

---

[1] Sherwani, *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*, p.46

نہیں کیا۔ کروڑوں میرے ساتھ تھے، اور خاص طور پر عوام! تعلیم یافتہ طبقہ آخر میں آیا۔ عوام پہلے آئے۔"[1]

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قیامِ پاکستان سے پہلے کی تاریخ کو مسلم لیگ کی نظر سے دیکھنے پر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ قوم نے اپنے متفقہ مقاصد بیس بیس برس کے عرصے میں حاصل کیے جس کا اصل سہرا اَن پڑھ اور غریب عوام کے سر جاتا ہے۔ صرف عارضی ناکامیوں اور مشکلات کی ذمہ داری تعلیم یافتہ طبقے کی کم نگاہی پر عائد ہوتی ہے:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا 'لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللہ'
حدیثِ دل کسی درویشِ بے گلیم[2] سے پُوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ
اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی، نہ محبّت، نہ معرفت، نہ نگاہ!

(اقبال)[3]

*

اب ہم دُوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔ کیا دنیا کی دُوسری قومیں بھی اُس زمانے میں اِسی قسم کے مراحل سے گزر رہی تھیں؟

---

[1] Jinnah, 9 August, 1947; Waheed Ahmad (ed.), *The Nation's Voice, Vol. VI,* p. 348

[2] "درویشِ بے گلیم" کا مطلب ہے وہ فقیر یا درویش جسے ایک چادر بھی میسر نہ ہو ("گلیم" اُونی چادر کو کہتے ہیں)۔

[3] اقبال، بالِ جبریل، ص ۶۹-۷۰

جی ہاں۔ اِس کی تفصیل میری انگریزی کتاب جناح نے ہندوستان کو آزادی کیسے دلوائی؟(How Jinnah Liberated India) کے علاوہ اِس سیریز کی کتاب حضرتِ انسان میں بھی تفصیل کے ساتھ دیا جاچکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انسانیت بے مقصد نہیں بھٹک رہی۔ بلکہ ہر دَور میں انسانیت کسی مخصوص مقصد کو ایک قدرتی طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ ہمارے دَور میں انسانیت کا مشترکہ مقصد یہ ہے کہ دنیا آزاد ریاستوں کا ایک خاندان بن جائے جس کی بنیاد انسانی رائے کے احترام اور اتفاقِ رائے (consent and consensus) پر ہو۔ اِس مقصد کے مقابل استعمار (imperial) کھڑا ہے جو انسان کو انسان کا غلام بنانا چاہتا ہے۔

جیسا کہ حضرتِ انسان میں تفصیل کے ساتھ بیان ہُوا ہے، ۱۸۸۷ء سے پوری انسانیت نے اِس منزل کی طرف اِس انداز میں بڑھنا شروع کیا ہے کہ ہر بیسویں برس ایک مرحلہ طے ہوتا ہے۔ مثلاً ہم نے یہاں برصغیر کے مسلمانوں کے حوالے سے جن تین مراحل کا ذکر کیا ہے، اُن کے ساتھ ساتھ برطانوی سلطنت بھی ایسے ہی مراحل سے گزر کر دولتِ مشترکہ یعنی آزاد ریاستوں کا ایک خاندان بن رہی تھی، جو مسلم لیگ کی نظر میں یہ ایک عظیم اور نیک مقصد تھا۔ تفصیل حضرتِ انسان کے تیسرے باب میں دیکھی جاسکتی ہے۔

*

اب ہم آخری سوال کی طرف آتے ہیں کہ آخر ہر مرحلہ بیس برس ہی میں کیوں مکمل ہُوا؟ کیا ہمیں آیندہ تاریخ کو بھی بیس بیس برس کے مراحل میں تقسیم کرنا پڑے گا؟ ایک منطقی ذہن کس طرح اِس پر راضی ہو سکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ بیس بیس برس کے مراحل ہم نے اپنی مرضی سے کسی پہلے سے طے

شدہ فارمولے کے تحت ترتیب نہیں دیئے ہیں۔ بلکہ ۱۸۸۷ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جن جن مواقع پر اعلان کیا کہ پچھلا مقصد حاصل ہو چکا ہے اور اب ایک نئے مرحلے کا آغاز ہے، ہم نے صرف اُن کی فہرست مرتب کی ہے۔ اتفاق سے اُن میں سے ہر مرحلہ بیس برس کے عرصے ہی میں مکمل ہوتا ہے۔

بالکل اِسی طرح اگر برطانوی سلطنت کے دولتِ مشترکہ میں تبدیل ہونے کے عمل کے اہم ترین سنگِ میل متعین کیے جائیں تو وہ بھی ان کے متوازی ہیں یعنی دولتِ مشترکہ کے ارتقأ کے مراحل بھی قدرتی طور پر ۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۶، ۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۶ء ہی بنتے ہیں۔ چونکہ برطانوی سلطنت اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور کئی براعظموں پر چھائی ہوئی تھی اِس لیے اُس کے دولتِ مشترکہ میں تبدیل ہونے کے مراحل ایک لحاظ سے اُس زمانے کی عالمی تاریخ کے مراحل بن جاتے ہیں۔

دُوسرے لفظوں میں اُس زمانے میں دنیا کی پوری تاریخ اِنہی بیس بیس برس کے مراحل میں بالکل قدرتی طور پر تقسیم ہو کر آگے بڑھ رہی تھی اور اُس زمانے کے لوگ اُسے اِسی طرح دیکھ بھی رہے تھے۔

چنانچہ ۱۸۸۷ء سے ۱۹۴۶ء کی تاریخ کو بیس بیس برس کے تین مراحل میں تقسیم کرنا اور ۱۹۴۷ء سے چوتھے مرحلے کا آغاز کرنا کوئی جدّت نہیں ہے جسے ہم متعارف کروا رہے ہوں۔ بلکہ یہ تو اُنہی لوگوں کا نقطۂ نظر ہے جو اُن واقعات کے زمانے میں زندہ تھے۔ ہم اُن کی تاریخ کو اُنہی کے نقطۂ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

جہاں تک ۱۹۴۷ء سے آگے کی تاریخ کا تعلق ہے، اُسے ہم بیس بیس برس کے مراحل میں صرف اُس صورت میں تقسیم کر سکتے ہیں جب ہر بیسویں برس مسلم لیگ کی

قراردادِ دہلی میں پیش کیے ہوئے اصولوں کے حوالے سے کوئی مرحلہ مکمل ہوتا دکھائی دے۔ کیونکہ ۱۹۴۷ء سے آگے کی تاریخ کو دیکھنے کے لیے ہماری اصل بنیاد وہی قرارداد ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں۔

باب ۸

نیا حوصلہ

۱۹۴۷ء–۱۹۶۶ء

آزادی سے پہلے کی تاریخ میں ہم نے دیکھا تھا کہ ہر مرحلے کے آغاز پر مسلم لیگ یعنی برصغیر کے مسلمان ایک مقصد متعین کرتے تھے اور اگلے بیس برس میں وہ مقصد قدرت کے قانون کے مطابق پورا ہو جاتا تھا۔ اِس لیے سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کی آزادی کے ساتھ ہمارے اِس سفر کے چوتھے مرحلے کا آغاز ہُوا تو لیگ اور مسلمانوں کے سامنے سب سے پہلا بڑا مقصد کیا تھا؟

اقبال نے انسان کا جو تصوّر پیش کیا ہے اُس کی تان اِس بات پر جا کر ٹوٹتی ہے کہ دنیا سے غربت، ناانصافی اور خوف کو مکمل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اِس کی تفصیل آپ اِسی سیریز کی کتاب اقبال کا فلسفہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ قائداعظم نے بھی اپنی ہر تقریر میں غربت کو ختم کرنے پر زور دیا تھا۔ بلکہ اُنہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ اگر پاکستان میں بھی غریبوں کا استحصال ہو تا رہے تو ”مجھے ایسا پاکستان نہیں چاہیے!“[1]

عالمی سطح پر اِس خواب کی تکمیل صرف اُسی صورت میں ممکن ہے جب قومیں اپنے معاملات جنگ کے بجائے باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے حل کرنے پر تیار ہوں اور وہ بے

[1] ۲۴ اپریل ۱۹۴۳ء کو دہلی میں لیگ کے سالانہ اجلاس کا خطبۂ صدارت

پناہ وسائل جو اِس وقت ہتھیاروں کی تیاری میں صرف ہو رہے ہیں، انسانوں کی تکالیف دُور کرنے کے کام میں لائے جائیں۔ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ کسی بھی ملک کے لیے اپنی سرحدوں کا دفاع سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایک ملک کے دفاع کو ملک میں بسنے والے افراد کی زندگیوں سے بھی زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

یورپ کی جدید تہذیب اِس انکشاف کے ساتھ شروع ہوئی تھی کہ تاریخ خود ہمیں اُس منزل کی طرف لے جارہی ہے جہاں جنگوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ اگرچہ وہ منزل ابھی بہت دُور ہے اور جب تک راستہ باقی ہے ہمیں اپنے دفاع کے لیے ہتھیار بھی استعمال کرنے پڑیں گے۔ لیکن ہمیں قدم بہ قدم اُس منزل کی طرف بھی بڑھنا ہے کیونکہ وہ منزل ایک دیوانے کا خواب نہیں بلکہ انسانیت کی تقدیر ہے۔

اِس بات کو تمام منطقی دلائل کے ساتھ جس شخص نے ثابت کیا وہ دَورِ جدید کا ایک بہت بڑا اور بعض لوگوں کی نظر میں سب سے بڑا فلسفی تھا۔ یعنی جرمنی کا امینوئیل کانٹ (Immanuel Kant)! اُس کا مقالہ "دائمی امن" (Perpetual Peace) آج تک اِس موضوع پر ایک سند سمجھا جاتا ہے جس میں کہا گیا تھا، "انسانیت کی تقدیر یہی ہے کہ آخرکار جنگیں اُسے ایک ایسی معقول حالت کی طرف دھکیل دیں جہاں قوانین کے سائے میں آزادی میسر ہو۔"

مسلم لیگ کی قراردادِ دہلی اِسی سلسلے کی ایک کڑی تھی کیونکہ اُس میں صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر کے لیے ایک منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ برصغیر کو عوام کی مرضی کے مطابق ایک سے زیادہ خودمختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک ریاست ہندوستان (موجودہ بھارت) ہو گی اور دُوسری ریاست پاکستان ہو گی۔ چنانچہ

قیامِ پاکستان کے موقع پر شاہِ برطانیہ جارج ششم نے پاکستان کے نام جو پیغام بھیجا اُس میں بالکل صاف طور پر کہا گیا، "آپ نے باہمی رضامندی کے ذریعے آزادی حاصل کر کے دنیا کی تمام آزادی پسند اقوام کے لیے ایک مثال قائم کی ہے۔"[1]

*

اِس کے برعکس کانگرس اور ۱۹۲۶ء کے بعد کی ہندو قیادت نے یہ مؤقف اختیار کیے رکھا تھا کہ پورے برصغیر کو ایک ملک بنا دیا جائے خواہ عوام کا مطالبہ اس کے برعکس ہو۔ بد قسمتی سے پاکستان کے قیام کے بعد بھی وہ قیادت اِسی مؤقف پر قائم رہی۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب کانگرس نے مجبوراً برصغیر کی تقسیم کو قبول کیا تو ہندو مہاسبھا نے انکار کرتے ہوئے اپنی قرارداد میں اعلان کیا کہ "ہندوستان ایک ہے، جس کا بٹوارہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور تب تک امن نہیں ہو گا جب تک الگ ہونے والے تمام علاقوں کو واپس اکھنڈ ہندوستان میں شامل کر کے اُنہیں اُس کا لازمی حصہ نہ بنالیا جائے۔"[2]

یہی بات ذرا سے گھماؤ پھراؤ کے ساتھ خود کانگرس نے بھی اپنی اُس قرارداد میں دہرائی جس کے ذریعے وہ تقسیم کے منصوبے کو قبول کر رہی تھی۔ اُس میں کہا گیا، "ہم نے ہندوستان کی جس تصویر سے پیار کرنا سیکھا ہے، وہ ہمارے من میں اور ہمارے دماغ میں ویسی ہی رہے گی، جیسی ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات دھیمے پڑ جائیں گے تو ہندوستان کے مسئلوں کو اُن کے صحیح تناظر میں دیکھا جائے گا اور ہر ایک اِس جھوٹے نظریے کو چھوڑ دے گا کہ ہندوستان میں دو قومیں بستی ہیں۔"[3]

---

[1] Constituent Assembly of Pakistan, *op. cit.,* pp.51, 52

[2] Mitra, *Indian Annual Register Jan-Jun 1947,* pp.256-25

[3] Mitra, *Ibid.,* p.123

اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے ساتھ قراردادِ دہلی کا صرف ایک حصہ نافذ ہُوا جس کا تعلق پاکستان سے تھا۔ بقیہ حصہ جس کا تعلق بھارت سے تھا ابھی نافذ ہونا باقی تھا۔ کیونکہ بھارت بد قسمتی سے دنیا کی ایک ایسی ریاست کے طور پر وجود میں آرہا تھا جو خود اپنے وجود سے منکر تھی۔

*

چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی آزادی کے ساتھ جو مرحلہ شروع ہُوا اُس میں برصغیر کے مسلمانوں یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کے سامنے یہ مقصد تھا کہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات کو قراردادِ دہلی میں پیش کیے ہوئے اِس اصول پر قائم کیا جائے کہ خطے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے خطے میں ایک سے زیادہ ریاستوں کے وجود کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

اتفاق سے پچھلے مقاصد کی طرح یہ مقصد بھی بیس برس بعد یعنی ۱۹۶۶ء ہی میں حاصل ہُوا لیکن پہلے سے زیادہ عجیب و غریب طریقے سے!

اِس دوران میں پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک بہت بڑا تنازعہ آزادی کے چند ہفتے بعد ہی جموں اور کشمیر کی ریاست کے مسئلے پر شروع ہو چکا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی بھاری اکثریت تھی لیکن مہاراجہ ایک ہندُو تھا۔ پاکستان کی خواہش تھی کہ اِس مسئلے کو دولتِ مشترکہ کے پلیٹ فارم پر حل کیا جائے اور دولتِ مشترکہ کے دوسرے ممالک کے وزرائے اعظم بھی اِس پر آمادہ تھے۔ لیکن بھارت تیار نہ ہُوا اور مسئلے کو اقوامِ متحدہ میں لے گیا۔ ۱۹۵۲ء تک وہاں بھی پاکستان نے اپنا اصولی مؤقف تسلیم کروالیا کہ کشمیر کا فیصلہ وہاں کے عوام کی مرضی کے مطابق کیا جائے۔ چنانچہ اقوامِ متحدہ نے فیصلہ دے دیا کہ کشمیر میں اِس سوال پر ریفرنڈم کروالیا جائے کہ اسے پاکستان یا بھارت میں سے کس ملک

میں شامل ہونا ہے۔

اِس سے پہلے کہ وہ ریفرنڈم ہوتا، خود پاکستان میں ایک بہت بڑا سیاسی انقلاب آ گیا۔ اپریل ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے بعض مفاد پرست عناصر کے ساتھ مل کر منتخب وزیرِ اعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا۔ اِس طرح اقتدار عملاً اُس جماعت کے ہاتھ سے نکل گیا جس نے پاکستان بنایا تھا۔ اگرچہ نئے وزیرِ اعظم کا تعلق بھی مسلم لیگ کے ساتھ جوڑا گیا لیکن اب اقتدار ایک مخصوص ٹولے کے ہاتھ میں تھا جس نے پاکستان کو بڑی تیزی کے ساتھ امریکی کیمپ میں دھکیل دیا۔ اِس بات کو بہانہ بنا کر بھارتی وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کشمیر میں ریفرنڈم کروانے سے انکار کر دیا۔

۱۹۵۳ء کے بعد کی سیاست کو پاکستان کی تاریخ قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اُسے محض اُن افراد کی سوانح سمجھنا چاہیے جو ملک کے اقتدار کو کھلونا سمجھ کر ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔

بہرحال اُس زمانے کی حد تک اُن کے سوانح کا خلاصہ یہی ہے کہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی توڑ دی گئی۔ اپریل ۱۹۵۵ء میں فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر نے یہ فیصلہ سنایا کہ پاکستان کبھی آزاد نہیں ہُوا تھا اور گورنر جنرل کو آئینی طور پر وہی اختیارات حاصل ہیں جو برطانوی عہد میں وائسرائے کو حاصل ہُوا کرتے تھے!

اُس کے بعد ایک طرف ایک نئی اسمبلی بنائی گئی جس نے ۱۹۵۶ء میں ایک آئین بنا کر ملک کو جمہوریہ قرار دے دیا۔ دوسری طرف ڈیفنس سیکرٹری اسکندر مرزا نے غلام محمد کو ہٹا کر گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا اور نیا آئین نافذ ہونے کے بعد صدر بن گئے۔ اُن کے عہدِ حکومت میں آئے دن وزیرِ اعظم تبدیل ہوتے رہے۔ بالآخر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اُنہوں نے آئین معطل کر کے ملک میں مارشل لاء لگا کر اپنے پرانے ساتھی اور پاکستانی افواج کے سپہ

سالار جنرل ایوب خاں کو چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر بنادیا۔

جلد ہی ایوب خاں نے اسکندر مرزا کو جلاوطن کر کے خود صدر کا عہدہ سنبھال لیا۔ ۱۹۶۴ء میں اُنہوں نے صدارتی انتخاب کروائے تو حزبِ مخالف (اپوزیشن) کی تقریباً تمام جماعتوں نے قائد اعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی اُمیدوار نامزد کیا۔ انتخاب میں ایوب خاں کے مقابلے پر فاطمہ جناح کی شکست کو عام طور پر دھاندلی کا نتیجہ سمجھا گیا۔

اگلے برس پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کے محاذ پر کشیدگی اِس حد تک بڑھی کہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بھارت نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر براہِ راست حملہ کر دیا۔ سترہ دنوں تک جاری رہنے والی اِس جنگ کو شروع کرنے کی ذمہ داری کس پر تھی اور جنگ کون جیتا؟ اِس سوال پر ماہرین ایک طول عرصے سے بحث کر رہے ہیں اور شاید ہمیشہ کرتے رہیں گے کیونکہ دورِ حاضر کی ہر جنگ فیصلہ کن ثابت نہیں ہوتی۔ پاکستان کے لیے اِس جنگ کی اصل اہمیت کچھ اور ہے۔

پاکستان ایک نئی ریاست تھی جو دنیا کے نقشے پر پہلے سے موجود نہیں تھے اور جسے آل انڈیا مسلم لیگ نے یہ کہہ کر قائم کیا تھا کہ عوام کی مرضی یہی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ نے ثابت کر دیا کہ عوام کی مرضی واقعی یہی تھی۔ کیونکہ اُس موقع پر پاکستان کے شہریوں نے اپنے ملک کے دفاع میں اپنی افواج کا بھرپور ساتھ دیا۔ اُس زمانے کے جو لوگ ابھی زندہ ہیں وہ زمانے کے تمام گرم و سرد کے باوجود آج بھی اُن سترہ دنوں کی یادوں کو دل میں سجائے ہوئے ہیں۔ اُس جنگ کے بعد پیدا ہونے والوں کی آنکھیں بھی میجر عزیز بھٹی اور اُس جنگ کے دُوسرے شہداء کے نام آنے پر نم ہو جاتی ہیں:

دل میں پیدا کیا اِک جذبۂ تازہ تُو نے
مِرے گیتوں کو نیا حوصلہ بخشا تُو نے

کیوں نہ تجھ کو اِنہی گیتوں کی نَوا پیش کروں!

(مسرور انور)

جنگ بندی کے کچھ مہینے بعد سوویت رُوس کی دعوت پر صدرِ پاکستان جنرل ایوب خاں اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری تاشقند میں اکٹھے ہوئے (جو اَب ازبکستان کا دارُالحکومت ہے)۔ ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو دونوں نے مشترکہ طور پر ایک اعلان کیا جسے معاہدۂ تاشقند (Tashkent Agreement) کہتے ہیں۔

اِس معاہدے کے تحت دونوں ممالک ایک دوسرے کے اُن علاقوں سے دستبردار ہونے پر تیار ہوگئے جن پر جنگ کے دوران اُنہوں نے قبضہ کیا تھا۔ یہ بھی طے پایا کہ کشمیر سمیت تمام باہمی معاملات کا تصفیہ جنگ کے بجائے مذاکرات کے ذریعے کیا جائے گا۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ معاہدے میں واضح طور پر اعلان کیا گیا کہ "وزیرِاعظم بھارت اور صدرِ پاکستان اِس بات پر متفق ہیں کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مطابق ہمسایہ ممالک کے درمیان جو تعلقات ہونے چاہئیں، بھارت اور پاکستان کے تعلقات کو ویسا بنانے کے لیے تمام کوششیں کی جائیں گی" اور "دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کا جاری رہنا اِس خطے اور بالخصوص برصغیر پاک وہند میں امن کے مفاد میں بہتر نہیں ہے۔ اور یقیناً بھارت اور پاکستان کے عوام کو بھی اِس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔"

اگرچہ اِس معاہدے میں مسلم لیگ کی ۱۹۴۶ء کی قرارداد اور کانگرس کی جون ۱۹۴۷ء کی "قرارداد کے حوالے نہیں دیئے گئے تھے لیکن تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو اِس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ معاہدۂ تاشقند کانگرس کی جون ۱۹۴۷ء کی اُس قرارداد کی واضح نفی تھی جس میں کانگرس نے کہا تھا کہ خطے کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ پورا برصغیر ایک ہی ریاست ہو اور پاکستان کو دوبارہ بھارت میں شامل کر لیا جائے۔ آج اُسی کانگرس کا

رہنما اپنے ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت میں اقرار کر رہا تھا کہ اِس کے بالکل برعکس اِس خطّے کی خوشحالی اُسی اصول میں مضمر ہے جو مسلم لیگ کی قراردادِ دہلی میں پیش کیا گیا تھا یعنی پاکستان اور بھارت دونوں آزاد ریاستوں کے طور پر موجود ہوں اور ایک دوسرے کی خودمختاری کا احترام کریں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بھارت میں خود کانگرسی حلقوں کی طرف سے معاہدۂ تاشقند کا خیر مقدم کیا گیا۔ انتہا پسند ہندو تنظیموں نے جو ہندُومہاسبھا کی جانشین تھیں عام طور پر اِس معاہدے کی مذمت کی کیونکہ اُن کے نزدیک بھارت کو پاکستان کے وہ علاقے واپس نہیں کرنے چاہیے تھے جو جنگ کے دوران قبضے میں آئے تھے۔ بالکل اِسی طرح پاکستان کے مغربی حصے میں بھی بہت سی سیاسی جماعتوں اور شخصیات نے اِس وجہ سے معاہدے کی مذمت کی کہ اُن کے نزدیک پاکستان کو بھارت کے وہ علاقے واپس نہیں کرنے چاہیے تھے جو جنگ کے دوران ہاتھ آئے تھے۔ البتہ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں عام طور پر اِس معاہدے کو پسند کیا گیا۔

*

وہ مسلم لیگ کب کی ختم ہو چکی تھی جس نے پاکستان بنایا تھا۔ حکومت اور دانشور بھی اُس لیگ کی قراردادِ دہلی اور اُس کے ساتھ وفاداری کے حلف کو بھلائے بیٹھے تھے۔ اِس کے باوجود اُس قرارداد کے ٹھیک بیسویں برس اُس کے نفاذ کا اگلا مرحلہ کچھ اِس طرح مکمل ہُوا تھا جیسے قدرت کا کوئی ایسا قانون حرکت میں آیا ہو جس سے ہم ابھی تک واقف نہیں ہیں۔

اگر پاکستان کی بانی لیگ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تو یہ ثابت ہو گیا تھا کہ ۱۹۵۳ء کے بعد بھی صرف رہنما اور دانشور راستہ بھٹکے ہیں۔ قوم اپنے راستے سے نہیں ہٹی ہے اور اپنے اجتماعی مقاصد کو متعین کر کے اُنہیں حاصل کرنے کے سلسلے کو بدستور جاری رکھے گی:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صُبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی اُن کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی اُن کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال
یہ اُمّتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں

(اقبال)[1]

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۷۰-۲۶۹

باب ۹

ہم ایک ہیں

۱۹۶۷ء—۱۹۸۶ء

پچھلے چاروں مراحل کے آغاز پر آل انڈیا مسلم لیگ موجود تھی جس نے قوم کے متفقہ مقصد کا اعلان واضح طور پر کر دیا تھا اِس لیے ہم بڑی آسانی کے ساتھ اُس مرحلے کو اُسی مقصد کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ ۱۹۶۶ء کے چوتھے مرحلے کے اختتام کے ساتھ اگلے مرحلے کا آغاز بھی ہُوا تو اُس زمانے کی سیاست کے میدان میں کوئی ایسی آواز موجود نہ تھی جو برصغیر کے تمام مسلمانوں یا کم سے کم پاکستان ہی کے تمام عوام کی واحد نمایندگی کر کے اُن کے متفقہ مقصد کو ظاہر کرتی۔

اِس کے باوجود ایک مؤرخ واضح طور پر دیکھ سکتا ہے کہ ملک کے دونوں حصوں میں ایک عام بیچینی جنم لے رہی تھی جس کا تعلق اِس بات سے تھا کہ عوام کو بھی زندگی کی بہتر سہولیات دستیاب ہونی چاہئیں اور ملک کے دونوں حصوں کے درمیان تعلقات بھی برابری پر مبنی ہونے چاہئیں۔ ۱۹۵۳ء کے بعد سے اقتدار زیادہ تر مغربی پاکستان کے ہاتھ میں رہا تھا اور مشرقی پاکستان کو شکایت تھی کہ نہ صرف اُس کی سیاسی آواز دبائی جا رہی ہے بلکہ اُس کا اقتصادی استحصال بھی کیا جا رہا ہے۔

چنانچہ ۱۹۶۶ء میں مشرقی پاکستان کی جماعت عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمان نے چھ نکات پیش کیے جن کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ صوبوں کو نیم خود مختار ہونا چاہیے۔ اُنہوں

نے کہا کہ وہ یہ نکات پاکستان کو کمزور کرنے کے لیے نہیں بلکہ پاکستان کی وحدت کو زیادہ مضبوط بنانے کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ حکومت نے اُن پر بھارت کے ساتھ مل کر ملک توڑنے کی سازش کا الزام لگا کر اُنہیں کچھ عرصے تک حراست میں رکھا۔ دوسری طرف مغربی پاکستان کے سیاستداں ذوالفقار علی بھٹو نے، جن کا کیریئر اسکندر مرزا کے ساتھ شروع ہوا تھا اور صدر ایوب کے ساتھ پروان چڑھا تھا، حکومت سے علیحدہ ہو کر پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھ دی۔

۱۹۶۹ء میں عوام کے احتجاج سے مجبور ہو کر صدر ایوب نے استعفیٰ دے دیا۔ اُنہوں نے ۱۹۶۲ء میں ایک آئین نافذ کیا تھا۔ اب اُنہوں نے اُسے خود ہی معطل کر کے دوبارہ مارشل لا لگا دیا جس کے تحت جنرل یحییٰ خاں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنے اور صدر کے عہدے پر بھی فائز ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات ہوئے۔ چونکہ صدر ایوب کے زمانے میں براہِ راست انتخاب کے بجائے ایک اور طریقہ رائج رہا تھا اِس لیے ۱۹۷۰ء کے انتخاب پاکستان کی تاریخ کے پہلے عام انتخاب شمار کیے جاتے ہیں۔

اِن انتخابات میں شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے واضح اکثریت حاصل کر لی لیکن اُس کے تمام نمایندے مشرقی پاکستان سے منتخب ہوئے تھے۔ مغربی پاکستان میں بھٹو نے سب سے زیادہ سیٹیں حاصل کی تھیں لیکن وہ مجیب الرحمان کے مقابلے میں نصف کے قریب تھیں اور زیادہ تر سندھ اور پنجاب تک محدود تھیں۔ صوبۂ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) اور بلوچستان میں دُوسری جماعتوں نے کامیابی حاصل کی تھی۔

گزشتہ چند برسوں میں پاکستان کی قومی اسمبلی کے بہت سے اجلاس ڈھاکہ میں واقع صوبائی اسمبلی کی عمارت میں ہوئے تھے کیونکہ ڈھاکہ کو پاکستان کا دُوسرا دارالحکومت قرار

دیا گیا تھا۔ انتخاب کے بعد صدرِ پاکستان اور بھٹو کی طرف سے اسمبلی کا اجلاس بلانے اور اقتدار شیخ مجیب کے حوالے کرنے میں پس وپیش کی جانے لگی۔

حالات اِتنے خراب ہوئے کہ مارچ ۱۹۷۱ء میں ملک میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے نعرے گونجنے لگے (حالانکہ انتخاب میں مشرقی پاکستان کے عوام نے عوامی لیگ کو پاکستان سے علیحدگی کے لیے نہیں پاکستان کو متحد رکھنے کے لیے ووٹ دیئے تھے)۔ افواجِ پاکستان نے اِس بغاوت کو دبانے کے لیے سخت کاروائی کی جس میں مغربی پاکستان کی بعض سیاسی شخصیات بالخصوص بھٹو نے بھرپور ساتھ دیا۔

بھارت نے اِس موقع پر مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش کے نام سے ایک علیحدہ ریاست کے قیام کی کھل کر حمایت کی۔ ۳دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان اور بھارت کے درمیان باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو گیا اور ۱۶ دسمبر کو مشرقی پاکستان میں موجود پاکستانی افواج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اِس موقع پر گرفتار ہونے والے پاکستانی جنگی قیدیوں کی تعداد روایتی طور پر نوّے ہزار بتائی جاتی ہے اگرچہ صحیح اعداد وشمار کے بارے میں کچھ اختلاف ہے۔

اِس طرح مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا اگرچہ بنگلہ دیش کی نئی حکومت نے اپنا یومِ آزادی ۲۶ مارچ ۱۹۷۱ء کو قرار دیا جب پاکستانی افواج نے وہاں بغاوت کو کچلنے کے لیے کاروائی کا آغاز کیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمان جنہیں اُس موقع پر گرفتار کر کے مسلسل قید میں رکھا گیا تھا اب رہا کر دیئے گئے اور بنگلہ دیش کے پہلے صدر بنے۔

پاکستان میں، جو اَب صرف مغربی پاکستان تک محدود رہ گیا تھا، بعض فوجی جرنیلوں نے یحییٰ خاں کو برطرف کر کے بھٹو کو صدر بنا دیا جو سویلین ہونے کے باوجود مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی بن گئے۔ ۱۹۷۳ء میں اُنہوں نے پاکستان میں ایک نیا آئین نافذ کیا جو ابھی تک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اگرچہ بعض ادوار میں عارضی طور پر معطل بھی رہ

چکا ہے۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں بھٹو نے ملک میں عام انتخاب کروائے۔ حزبِ اختلاف نے دھاندلی کا الزام لگا کر اُن انتخابات کے ذریعے بننے والی پارلیمنٹ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ بھٹو صاحب نے ایک دفعہ پھر فوج کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہوئے مارشل لا لگا دیا اور نئے پاکستان میں بھی چھوٹے پیمانے پر خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اُس کے بعد ایک طرف لاہور ہائی کورٹ نے بھٹو کے مارشل لا کو غیر قانونی قرار دیا اور دوسری طرف ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو سپہ سالار جنرل ضیا الحق نے باقاعدہ مارشل لا لگا کر ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو بھٹو کو ایک قتل کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔ جنرل ضیا صدر بن گئے اور ۱۹۸۸ء تک اِس عہدے پر فائز رہے۔ ۱۹۸۵ء میں اُنہوں نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کروائے جن کے نتیجے میں محمد خاں جونیجو وزیر اعظم بنے اور ۱۹۸۸ء تک رہے۔ اُس وقت تک ملک میں مسلم لیگ کے عنوان سے نئی سیاسی جماعتیں وجود میں آ چکی تھیں اور جونیجو کا تعلق بھی ایسی ہی ایک جماعت سے تھا۔

*

اِس دوران بنگلہ دیش میں ۱۹۷۵ء میں بعض فوجیوں نے شیخ مجیب الرحمان کو ہلاک کر دیا تھا۔ چند برس تک بنگلہ دیش میں ہلچل رہی جس کے بعد ۱۹۷۶ء میں وہاں کے سپہ سالار جنرل ضیاالرحمان نے اقتدار سنبھالا۔ بعد میں وہ صدر بھی بن گئے اور ۱۹۸۱ء تک حکومت کرتے رہے جب بعض فوجیوں نے اُنہیں بھی قتل کر دیا۔

ایک سال کی سویلین حکومت کے بعد ۱۹۸۲ء میں جنرل حسین محمد ارشاد نے دوبارہ

مارشل لا لگا دیا۔ بعد میں وہ صدر بھی بن گئے اور ۱۹۹۰ء تک اُس عہدے پر فائز رہے۔

*

بھارت میں آزادی کے بعد سے اب تک زیادہ تر پنڈت جواہر لال نہرو کے خاندان نے حکومت کی تھی۔

آزادی کے بعد نہرو بھارت کے پہلے وزیر اعظم بنے تھے اور ۱۹۶۴ء میں اپنی وفات تک اِس عہدے پر فائز رہے تھے۔ اُن کی وفات کے بعد ایک اور کانگرسی سیاستداں لال بہادر شاستری وزیر اعظم بنے لیکن بمشکل ڈیڑھ برس بعد جنوری ۱۹۶۶ء میں پراسرار حالات میں فوت ہو گئے (۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ اُنہی کے زمانے میں ہوئی تھی اور معاہدۂ تاشقند پر دستخط بھی اُنہوں نے کیے تھے)۔

۱۹۶۶ء میں نہرو کی صاحبزادی اندرا گاندھی وزیر اعظم بنیں اور ۱۹۸۴ء میں قتل ہونے تک اِس عہدے پر فائز رہیں، سوائے ڈھائی تین برس کے عرصے کے جب ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک وہ حکومت سے محروم تھیں۔ اندرا کے بعد اُن کے بیٹے راجیو گاندھی وزیر اعظم بنے اور ۱۹۸۹ء تک اِس عہدے پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۹۱ء میں قتل ہوئے۔

*

خطے کی سیاست کی اِن طوفانی لہروں کے نیچے قدرت ایک بہت بڑا ساحل تشکیل دے رہی تھی جو حیرت انگیز طور پر اُبھر کر سامنے آنے والا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۷۷ء میں بنگلہ دیش کے اُس وقت کے صدر ضیاالرحمان نے جنوبی ایشیا کے دُوسرے ممالک کے ساتھ باہمی تعاون کی ایک تنظیم بنانے کے لیے گفت و شنید کا آغاز کیا۔ ان ممالک کی اندرونی سیاست کے اُتار چڑھاؤ کے علاوہ ایک دوسرے کے

خلاف ان کے شکوک و شبہات اور ماضی کی تلخ یادیں کچھ ایسی تھیں کہ بظاہر ایسی کسی تنظیم کا قیام ناممکن ہی سمجھا جاسکتا تھا۔

پھر بھی یہ کوششیں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہیں اور بنگلہ دیش کے صدر حسین ارشاد کے دورِ حکومت میں ۸ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ڈھاکہ میں جنوبی ایشیا کے سات ممالک کے سربراہوں کا اجلاس ہُوا۔ یہ ممالک بنگلہ دیش، پاکستان، بھارت، سری لنکا، بھوٹان اور مالدیپ تھے۔ تمام سربراہوں نے ایک چارٹر پر دستخط کیے جس کے نتیجے میں جنوبی ایشیا کی تنظیم برائے علاقائی تعاون یعنی سارک (SAARC) وجود میں آگئی۔ اگلے برس یعنی ۱۹۸۶ء میں یہ تنظیم فعال ہو گئی۔

یہ درست ہے کہ عملاً یہ تنظیم اپنا وہ کردار ادا نہ کر سکی جس کی توقع تھی اور اب کچھ عرصے سے اِس کا وجود نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ اِس کے باوجود اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اِس تنظیم کا وجود میں آنا مسلم لیگ کی ۱۹۴۶ء کی قراردادِ دہلی کی ایک اور اخلاقی فتح تھی۔ تنظیم کے چارٹر میں جن باتوں کو خطّے کے امن، خوشحالی اور اقتصادی ترقی کے لیے ضروری قرار دیا گیا، وہ تھیں، "خود مختارانہ مساوات، علاقائی سالمیت، قومی آزادی، طاقت کا عدم استعمال اور دوسری ریاستوں کے داخلی معاملات میں دخل نہ دینا اور تمام تنازعات کا پُرامن حل"!

ہم جانتے ہیں کہ یہ آئیڈیل مسلم لیگ ہی نے ۱۹۴۶ء کی قراردادِ دہلی میں پیش کیا تھا ورنہ کانگرس کے اصل وژن کے مطابق تو خطّے کی سات ریاستوں میں سے کم از کم دو بڑی ریاستوں یعنی پاکستان اور بنگلہ دیش کا وجود ہونا ہی نہ چاہیے تھا اور اُنہیں بھارت ہی کا حصہ رہنا چاہیے تھا۔

اِس طرح ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی قراردادِ دہلی کو صرف برصغیر کے مسلمانوں نے

قبول کیا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں اسے بھارت نے بھی قبول کر لیا۔ اور ۸۶-۱۹۸۵ء میں اسے قبول کرنے والے ممالک کی تعداد دو سے بڑھ کر سات ہو گئی (۲۰۰۷ء میں افغانستان بھی اِس تنظیم میں شامل ہو گیا)۔

ایک دلچسپ اتفاق یہ بھی تھا کہ اگرچہ اِس تنظیم کا سیکرٹریٹ نیپال کے دارُالحکومت کٹھمنڈو میں قائم ہُوا لیکن اِس کے چارٹر پر دستخط اُسی شہر ڈھاکہ میں کیے گئے جہاں اُناسی (۷۹) برس پہلے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی:

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اِس نکتے سے اب تک بیخبر!

(اقبال)[1]

[1] اقبال، 'خضرِ راہ'، بانگِ درا، ص ۳۰۱

باب ۱۰

کابل سے لندن تک

۱۹۸۷ء–۲۰۰۶ء

اِس دوران دنیا کے اسٹیج پر ایک اور بہت بڑا کھیل شروع ہو چکا تھا جس میں پاکستان ایک مرکزی کردار ادا کر رہا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب برصغیر کو آزادی ملی تو دُنیا دو کیمپوں میں تقسیم ہو رہی تھی۔ ایک طرف رُوس تھا جس نے وسطی ایشیا اور مشرقی یورپ کی بہت سی ریاستوں کو شامل کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی جو سوویت یونین (Soviet Union) کہلاتی تھی۔ یہ سلطنت اِشتراکیت یعنی کمیونزم (communism) کے نظریے کا پرچار کر رہی تھی۔ مختصر ترین الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظریہ مزدوروں کی حکومت کا قائل تھا اور معاشرے میں اقتصادی برابری چاہتا تھا اگرچہ عملاً کبھی ایسا نہ ہو سکا۔ اس کے مقابلے پر امریکہ اور یورپ کے وہ ممالک تھے جو سرمایہ داری (capitalism) کے حامی تھے یعنی دولت کے حصول پر مروجہ قوانین کے سوا کوئی اخلاقی روک ٹوک نہ ہونی چاہیے۔

سوویت رُوس اور امریکہ ایک دوسرے پر براہِ راست حملہ کرنے کے بجائے دنیا کے دُوسرے ممالک بالخصوص غریب ترقی پذیر ممالک کو ایک ساتھ ملانے کی کوشش کرتے تھے، وہاں اپنے نظریات کے حامیوں کو حکومت میں لانے کے لیے خونریز بغاوتیں کرواتے تھے اور بعض اوقات اُن ممالک کو اپنی باہمی آویزش کے لیے میدانِ جنگ بھی

بنادیتے تھے۔

پاکستان کا قریبی ہمسایہ افغانستان دُوسری جنگِ عظیم کے زمانے سے رُوس کے اثر میں تھا اور اِس وجہ سے پاکستان کے ساتھ اُس کے تعلقات عام طور پر خراب رہے تھے۔ یہ بات افسوسناک تھی کیونکہ اُس سے پہلے علامہ اقبال نے وہاں کی سیاست میں اچھا خاصا حصہ لیا تھا اور وہاں ایک جدید طرز کی روشن خیال اسلامی جمہوریت قائم کرنے کے لیے عمر بھر جدوجہد کرتے رہے تھے (اِن خدمات کے اعتراف میں اقبال کے مزار کا اکثر سنگِ مرمر اور دُوسرے قیمتی پتھر افغان حکومت کی طرف سے بھیجے گئے جو آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں)۔ اپنی تصنیف جاویدنامہ میں اقبال نے جدید افغان قوم کے بانی احمد شاہ ابدالی کی زبانی کہلوایا، ''پورا ایشیا ایک جسم ہے اور افغان قوم اُس میں دل کی طرح ہے۔ وہاں فساد کا مطلب پورے ایشیا میں فساد ہے، اور وہاں کی خوشحالی پورے ایشیا کی خوشحالی ہے۔''

آسیا یک پیکر آب و گل است — ملّتِ افغان در آں پیکر دل است

از فسادِ اُو فسادِ آسیا — در کشادِ اُو کشادِ آسیا[1]

اپریل ۱۹۷۸ء میں افغانستان کی ایک کمیونسٹ سیاسی جماعت نے ایک خونریز بغاوت کے ذریعے حکومت پر قبضہ کر لیا اور رُوس کی کٹھ پتلی بن گئی۔ کمیونسٹ نظریے میں مذہب کی کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ نظریہ خدا کے وجود سے منکر تھا۔ افغان عوام، جن میں سے زیادہ تر راسخ العقیدہ مسلمان تھے، نئی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین نے اپنی کٹھ پتلی حکومت کو بچانے کے لیے افغانستان پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ رُوسی مظالم کے نتیجے میں کروڑوں عوام اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ بہت سے ایران کی سرحد عبور کر کے وہاں چلے گئے لیکن افغان مہاجرین کی سب سے بڑی تعداد

---

[1] اقبال، جاوید نامہ، ص ۲۰۸

پاکستان آن پہنچی کیونکہ پاکستان نے اُن کے لیے اپنی سرحد کھول دی تھی۔

کچھ عرصے تک پاکستان تنہا رُوسی سپر پاور کے خلاف ڈٹا رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ پاکستانی صدر جنرل ضیا امریکہ، سعودی عرب اور دُوسرے ممالک کو بھی افغانستان کے دفاع کے لیے متحرک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بیرونی امداد کے ساتھ پاکستان نے افغان مجاہدین کو تربیت اور ہتھیار فراہم کر کے اُنہیں سوویت یونین کے خلاف ایک طویل جدوجہد کے قابل بنایا۔

لہٰذا اگر ہم ۱۹۸۶ء میں سارک کے قیام کو پانچویں مرحلے کا اختتام اور ۱۹۸۷ء کو چھٹے مرحلے کا آغاز تصوّر کریں تو یہ نیا مرحلہ اِس انداز میں شروع ہُوا کہ افغانستان میں رُوس کی شکست کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ اپریل ۱۹۸۸ء میں "جنیوا معاہدوں" (Geneva Accords) کے ذریعے سوویت یونین افغانستان سے افواج واپس بلانے پر راضی ہو گیا اور فروری ۱۹۸۹ء میں آخری رُوسی سپاہی بھی اُس سرزمین سے رخصت ہو گیا۔

اِس دوران خود پاکستان میں ایسی سیاسی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھی کہ نہ اِس بدنصیب ملک کو اپنی فتح پر خوش ہونے کا موقع نصیب ہو سکا اور نہ ہی افغانستان میں پیدا ہونے والے خلا کو پُر کر کے وہاں کوئی ڈھنگ کی حکومت قائم کروانے کا کام ہو سکا۔

جنیوا معاہدوں کے چند ماہ بعد اگست ۱۹۸۸ء میں جنرل ضیا ایک پراسرار فضائی حادثے کے شکار ہو گئے۔ اُن کے بعد انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوئے اور پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی جس کی قیادت ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی محترمہ بینظیر کر رہی تھیں۔ مذہبی رجحان رکھنے والی سیاسی جماعتوں کا ایک اتحاد اُن کی مخالفت میں جنرل ضیا کے ورثے کا امین ہونے کا دعویدار تھا اور اُس اتحاد کی قیادت میاں نواز شریف کر رہے تھے جن کی جماعت مسلم لیگ کہلانے والی جماعتوں میں سے ایک تھی۔ اگلے دس برس تک یہ دونوں حریف

اِس طرح ایک دُوسرے کے خلاف کمربستہ رہے کہ جب بھی کوئی ایک حریف حکومت میں آیا، دُوسرے نے دوڈھائی برس کے عرصے میں اُسے فوج، عدالت یا صدارت کی مدد سے فارغ کروا دیا۔ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کو ہٹا کر (جو دُوسری دفعہ وزیرِاعظم بنے تھے)، فوجی حکومت قائم کر دی جو ۲۰۰۸ء تک قائم رہی۔

اِسی سیاسی تماشے میں جو اہم باتیں نظر انداز ہوئیں اُن میں سب سے پہلی یہ تھی کہ ۱۹۴۰ء میں جب برصغیر کے مسلمانوں نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیا تو بعض ہندو رہنماؤں کی طرف سے کہا گیا تھا کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو وہاں کے مسلمان کسی دُوسرے اسلامی ملک بالخصوص افغانستان کو ساتھ ملا کر ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے جیسا کہ محمود غزنوی سے لے کر احمد شاہ ابدالی کے زمانے تک افغان برصغیر پر حملے کرتے رہے تھے۔ جواب میں قائدِاعظم نے کہا تھا، ’’ہندو، جنوب اور مغرب کی حفاظت کریں، اور مسلمانوں کو برصغیر کی [شمال مغربی] سرحدوں کی حفاظت کرنے دیں۔ ہم اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں۔ ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوئے دنیا سے کہیں گے، ’ہندوستان کو ہاتھ مت لگانا! ہندوستان وہاں رہنے والوں کا ہے!‘‘‘ افغانستان میں سوویت مداخلت روک کر پاکستان نے بھارت کے الزام کو غلط اور جناح کے قول کو درست ثابت کر دیا تھا کیونکہ افغانستان کا دفاع درحقیقت پورے برصغیر کا دفاع بھی تھا۔

دُوسری اور نسبتاً زیادہ اہم بات یہ تھی کہ افغانستان میں سوویت یونین کو جو ناکامی ہوئی وہ اُن اسباب میں سے ایک تھی جنھوں نے سوویت یونین کو مجبور کیا کہ وہ اپنی ’’تنظیمِ نَو‘‘ کر کے ایک نئی پالیسی اپنائے۔ اُسی تنظیمِ نَو کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو سوویت یونین نے افغانستان سے اپنی فوجیں واپس بلائیں۔ دُوسری طرف جرمنی، جسے دوسری جنگِ عظیم کے بعد وہاں کے لوگوں کی مرضی کے خلاف دو حصوں میں تقسیم کر کے

مشرقی حصہ سوویت یونین کی نگرانی میں دے دیا گیا تھا، دوبارہ متحد ہو سکا۔ کیونکہ سوویت یونین نے اپنی نئی پالیسی کے تحت مشرقی جرمنی سے ہاتھ اُٹھالیا۔

یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ اقبال نے جرمن قوم کے ساتھ اپنی گہری محبت جس کتاب میں ظاہر کی تھی اُس کا انتساب افغانستان کے ایک روشن خیال حکمران کے نام کیا تھا (یعنی ۱۹۲۳ء میں شائع ہونے والی پیامِ مشرق، جس کا انتساب امیر امان اللہ کے نام تھا)۔ اور ایک طرح سے افغان قوم ہی جرمن قوم کو دوبارہ متحد کرنے کا ایک ذریعہ بنی کیونکہ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، افغانستان میں سوویت یونین کی ناکامی بھی سوویت یونین کی اُس نئی پالیسی کی ایک وجہ تھی جس کے تحت جرمنی دوبارہ متحد ہو سکا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سوویت یونین کی نئی پالیسی کے نتیجے میں خود سوویت یونین بھی ختم ہو گیا۔ یعنی رُوس نے وہ نئی صورت اختیار کی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اور مشرقی یورپ اور وسطی ایشیا کی جن ریاستوں پر اُس نے اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر رکھی تھی، اُنہیں آزادی مل گئی۔ اُن میں نہ صرف یوکرین جیسی یورپی ریاستیں شامل تھیں جو آج کل خاص طور پر خبروں کا موضوع ہیں بلکہ وسطی ایشیا کی ایسی مسلمان ریاستیں بھی شامل تھیں جہاں سوویت ڈکٹیٹر شپ کے زمانے میں اقبال کی شاعری نے آزادی کا جذبہ زندہ رکھنے میں مدد فراہم کی تھی۔ چنانچہ اب اُن میں سے بعض ریاستوں میں اقبال کو قومی شاعر جیسی حیثیت دی جا چکی ہے:

اِک ولولۂ تازہ دیا مَیں نے دِلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

(اقبال)[1]

---

[1] اقبال، 'شکر و شکایت'، ضربِ کلیم، ص ۱۵

دُوسری طرف مشرقی یورپ کے سوویت تسلط سے آزاد ہونے کی وجہ سے یورپین یونین کا قیام بھی ممکن ہو سکا جس کے خواب یورپ میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ہی دیکھے جا رہے تھے اور اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں بھی اِس کا ذکر کیا تھا۔

اِس طرح سرد جنگ بھی اپنے اختتام کو پہنچی جو دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے دنیا کی دو بڑی طاقتوں اور اُن کے متصادم نظریات کے درمیان جاری تھی، اور جس کی وجہ سے نیوکلئیر اسلحے کی دَوڑ اُس مقام تک جا پہنچی تھی جہاں پورے سیارے کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا (اگرچہ ۱۹۹۸ء میں بھارت کے نیوکلئیر دھماکے کے بعد پاکستان کو بھی نیوکلئیر قوّت بننا پڑا تھا)۔

اگر ہم یہ سمجھیں کہ سرد جنگ کے خاتمے میں پاکستان نے بھی ایک کردار ادا کیا تھا، تو لیاقت علی خاں کی پیشگوئی پوری ہو جاتی ہے جو اُنھوں نے ۱۹۴۹ء میں کی تھی جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے (قراردادِ مقاصد کے ذریعے) اسلام کو پاکستان کے آیندہ آئین کی بنیاد قرار دیا تھا۔ لیاقت علی خاں نے کہا تھا، "میرے ذہن میں اِس بارے میں معمولی سا شبہ بھی نہیں ہے کہ ایک دن آئے گا، جب لوگ شکر گزار ہوں گے، انسانیت شکر گزار ہو گی، آپ کی اور ہماری۔ کہ ہم نے وہ چیز تخلیق کی جو بنی نوعِ انسان کے لیے امن اور خوشحالی لائے گی۔ اور اُسے اپنے آپ کو تباہ کرنے سے روک لے گی۔"[1]

بدقسمتی سے افغانستان، سوویت مداخلت سے آزاد ہونے کے بعد ایک طویل خانہ جنگی میں مبتلا رہا۔ اُسے مزید بیرونی حملوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ۲۰۰۶ء میں اُس نے اپنے آپ کو مربوط کیا۔ اُس برس اُسے بھی جنوبی ایشیا کی تنظیم (سارک) میں شامل کرنے کا فیصلہ ہُوا اور اگلے برس وہ باقاعدہ رُکن بن گیا۔

---

[1] M. Rafique Afzal (ed.), *Speeches and Statements of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan (1941-51),* p. 244

دُوسری طرف ۲۰۰۶ء ہی میں لندن میں پندرہ بین الاقوامی تنظیموں اور چھیاسٹھ (٦٦) ممالک کے نمایندے اِس بات پر متفق ہوئے کہ افغانستان کے استحکام اور خوشحالی میں اپنا کردار ادا کریں۔ اُن ممالک میں پاکستان بھی شامل تھا۔ اِس سمجھوتے کو میثاقِ افغانستان (The Afghanistan Compact) کا نام دیا گیا۔

اگرچہ یہ سمجھوتہ صرف پانچ برس کے لیے تھا لیکن اِس میں افغانستان کے لیے ایک مستقل بنیاد بھی فراہم کی گئی۔ ظاہر ہے کہ میثاقِ افغانستان تحریر کرنے والوں نے اقبال کی تحریریں اپنے سامنے نہیں رکھی ہوں گی لیکن تاریخ کی گردش اُنہیں اُس مقام پر لے آئی تھی جہاں وہ سب افغانستان کے مستقبل کے لیے اُنہی تجاویز پر متفق ہو گئے تھے جو علامہ اقبال نے ۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق کی انتسابی نظم اور اُس کے بعد اپنی کئی تحریروں اور بیانات میں فراہم کی تھی۔ میثاقِ افغانستان میں کہا گیا:

> اسلامی جمہوریہ افغانستان اور بین الاقوامی برادری۔۔۔اِس ارادے کے ساتھ کہ افغان عوام کی زندگیوں کو بہتر بنانے میں حصہ لے، اور قومی، علاقائی اور عالمی امن اور استحکام میں شریک ہو۔۔۔ افغانوں کی ہمت اور عزم کا اعتراف کرتے ہوئے جنہوں نے پر تشدد انتہاپسندی اور مشکلات کو مسترد کر کے اِسلام کے اصولوں پر مبنی جمہوری، پر امن، روادار اور خوشحال ریاست کی بنیادیں رکھی ہیں۔۔۔اِس میثاقِ افغانستان پر متفق ہوئی ہے۔

''اِسلام کے اصولوں پر مبنی جمہوری، پر امن، روادار اور خوشحال ریاست'' ہی افغانستان کے لیے اقبال کا خواب تھا۔ اُنہوں نے کمیونزم اور قدامت پسندانہ انتہا پرستی دونوں کی سخت مخالفت کی تھی لیکن بد قسمتی سے اب تک افغانستان اِنہی دو نظریات کی باہمی کشمکش میں اُلجھا رہا تھا۔

اِس لیے میثاقِ افغانستان کو اُسی راستے کا ایک سنگِ میل سمجھا جا سکتا ہے جس کے سابقہ سنگِ میل آل انڈیا مسلم لیگ کی ۱۹۴۶ء کی قراردادِ دہلی، معاہدۂ تاشقند اور جنوبی ایشیا کی تنظیم کے چارٹر کی صورت میں تاریخ نے ہمارے سامنے پیش کیے تھے۔ اگر سارک کے چارٹر کے ذریعے سات ممالک نے مسلم لیگ کی ۱۹۴۶ء کی قراردادِ دہلی کی غیر شعوری طور پر توثیق کی تھی تو اِس دفعہ چھیاسٹھ (٦٦) ریاستیں توثیق کر رہی تھیں:

دیکھے تُو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
اَفلاک منوّر ہوں ترے نورِ سحَر سے!
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے!
ظاہر تری تقدیر ہو سِیمائے قمر سے!
دریا مُتَلاطم ہوں تِری موجِ گُہر سے!
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہُنَر سے!
اغیار کے افکار و تخیّل کی گدائی!
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی؟

(اقبال)[1]

[1] اقبال، 'جدّت'، ضربِ کلیم، ص ۱۲۱-۱۲۰

باب ۱۱

آخری معرکہ

۲۰۰۷ء–۲۰۲۶ء

کھول کر آنکھیں مِرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دَور کی دُھندلی سے اِک تصویر دیکھ!

(اقبال)[1]

*

پچھلے ہر مرحلے کے اختتام پر خودبخود قراردادِ دہلی کی توثیق ہوتی گئی اور دنیا اسے پہچاننے میں ناکام رہی۔ لیکن اب ہم اُس سفر کے آخری مرحلے کے اختتام پر کھڑے ہیں۔ لہٰذا اِس دفعہ یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ خودبخود کوئی مثبت تبدیلی رونما ہو جائے۔

اِس دفعہ ہر قوم کو شعوری طور پر ایک اہم فیصلہ کرنا ہو گا۔

ورنہ سات مراحل کا یہ سفر تباہی اور بربادی پر بھی ختم ہو سکتا ہے۔ کوئی ایسی ڈکٹیٹر شپ بھی رائج ہو سکتی ہے جو صدیوں تک قائم رہے۔ پچھلے دو تین سو سال میں انسانیت نے جمہوریت، بین الاقوامی قوانین اور انسانی حقوق کے حوالے سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب ختم ہو کر اُسی طرح مٹ سکتے ہیں جس طرح قدیم یونان، قدیم روم

[1] اقبال، 'خضرِ راہ'، بانگِ درا، ص ۳۰۳

اور عباسی بغداد کی رونقیں اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہیں۔

وہ اہم فیصلہ کیا ہے اور اُس کے لیے عوام کو متحد کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

یہ باب اِسی سوال کا جواب ہے کیونکہ جب ہم موجودہ مرحلے کو مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

*

اگر ہم دنیا کا جائزہ لیں تو واضح دکھائی دیتا ہے کہ ۲۰۰۷ء سے اب تک صرف وہی تحریکیں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکی ہیں جن میں عوام نے کسی رہنما کے بغیر خود کو منظم کیا اور جو کسی پیچیدہ نظریے کے بجائے کسی بنیادی اصول پر قائم ہوئیں۔

اِس قسم کی اولین تحریک پاکستان ہی سے شروع ہوئی۔ مارچ ۲۰۰۷ء میں اُس وقت کے صدر جنرل پرویز مشرف نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو آئینی تقاضے پورے کیے بغیر اپنی مرضی سے معطل کر دیا۔ حالانکہ اُس وقت پرویز مشرف اپنی مقبولیت کی انتہا پر تھے لیکن حیرت انگیز طور پر عوام اُن کے اِس اقدام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلا احتجاج وکیلوں کی طرف سے ہوا اِس لیے اِسے تحریکِ وکلاء (The Lawyers' Movement) کہا جاتا ہے۔ لیکن عملاً اِس تحریک میں معاشرے کے ہر طبقے اور تقریباً ہر مکتبِ فکر نے حصہ لیا۔ مذہبی تنظیمیں اور ترقی پسند تنظیمیں قیامِ پاکستان کے زمانے سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہی تھیں لیکن اب اُن کے کارکن ایک دوسرے کے ساتھ شانہ بشانہ دکھائی دیئے۔ جو لوگ پرویز مشرف کی روشن خیالی کی وجہ سے اُن کی ڈکٹیٹر شپ کو نظر انداز کر کے اُن کی حمایت کرتے رہے تھے، اُن میں سے بھی اکثر ایک لمحے میں اُن کے خلاف تحریکِ وکلا میں شامل ہو گئے۔

چند برس کی جدوجہد کے بعد یہ تحریک معزول چیف جسٹس کو بحال کروانے میں کامیاب ہوگئی۔ اگرچہ اُن چیف جسٹس نے، جن کا نام افتخار احمد چوہدری تھا، عوام کو سخت مایوس کیا لیکن تحریک اِس وجہ سے نہیں چلی تھی کہ چوہدری صاحب کی ذات سے کسی کو کوئی توقع تھی۔ تحریک تو صرف اِس اصول کو منوانے کے لیے چلائی گئی تھی کہ کوئی بھی حکمراں عدالتی نظام کو اپنا غلام نہیں بنا سکتا۔

اگر ہم پاکستان سے باہر کی دنیا پر نظر ڈالیں تو ہمیں وہ مناظر دکھائی دیتے ہیں جنہیں اِس سیریز کی ایک اور کتاب حضرتِ انساں میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۲ء تک مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں آمریت کے خلاف ربیع العربی (*Arab Spring*) یعنی بہارِ عرب کی تحریکوں میں سے اکثر میں، اور اُسی زمانے میں سرمایہ داری کے خلاف اسپین میں عوامی احتجاج (*Spanish Indignados*) اور امریکہ میں وال اسٹریٹ پر قبضے (*Occupy Wall Street*) کے دوران بھی لوگ خود ہی منظم ہوئے۔ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں ہانگ کانگ میں ایک غیر پسندیدہ قانون کے خلاف احتجاج کرنے والوں نے برُوس لی (Bruce Lee) کے ایک فلمی مکالمے "پانی ہو جاؤ" (*"Be water"*) پر عمل کر کے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ہزاروں، لاکھوں اور بعض مواقع پر دس بیس لاکھ مظاہرین کسی رہنما کے بغیر ہی ایک جسم کے اعضا کی طرح حرکت میں آتے تھے اور ریاستی اداروں کے ہر منصوبے کو ناکام بنا دیتے تھے۔
>
> ۲۰۱۸ء میں سوئیڈن کی پندرہ سالہ لڑکی گریٹا تھرنبرگ (*Greta Thurnberg*) نے ماحولیاتی تبدیلی (*climate change*) کے خلاف تنہا احتجاج شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک عالمی تحریک میں تبدیل ہو گیا جس میں دنیا

کے بڑے بڑے سیاستدانوں کو حصہ لینا پڑا۔

۲۰۲۰ء میں دنیا کووِڈ-۱۹(COVID-19) کی ہولناک عالمی وبا سے بھی دوچار ہوئی جس نے ۲۰۱۹ء سے ۲۰۲۳ء کے عرصے میں اندازاً ڈیڑھ دولاکھ افراد کو ہلاک کر دیا۔ ۲۰۲۰ء میں اِس وبا کی وجہ سے لوگوں کے آپس میں ملنے جلنے پر پابندی عائد کرنی پڑی تو تعلیم، کاروبار، ملازمت، علاج معالجہ اور یہاں تک کہ ملکوں کی وزارتوں اور پارلیمنٹوں کے اجلاس بھی آن لائن کیے گئے۔ اِس تجربے نے انسانوں کو سوشل میڈیا کے ذریعے خود کو منظم کرنے کے رجحان کی طرف اور بھی زیادہ تیزی کے ساتھ دھکیل دیا ہے۔

*

اگر ہم غور کریں تو اِن تمام تحریکوں کی کامیابی اُسی اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے رُوسو نے "جنرل وِل" (general will) کے نام سے پکارا تھا، جس پر مسلم لیگ قائم تھی اور جو قراردادِ دہلی کی بنیاد ہے۔

اِس روشنی میں آپ ذرا اُس بات پر غور کیجیے جو قائداعظم نے ۱۹۴۰ء میں مسلمانوں کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ مسلم لیگ کے اُسی اجلاسِ لاہور میں جہاں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی، قائداعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں بڑی تفصیل کے ساتھ واضح کیا تھا کہ اُن کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے اور تمام اہمیت صرف مسلم لیگ اور مسلمان قوم کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اُن کے طویل سیاسی کیریئر میں کسی وائسرائے نے کبھی انہیں خصوصی مذاکرات کے لیے نہیں بلایا اور تمام وائسرائے صرف گاندھی کے ساتھ مذاکرات کرتے رہے۔ لیکن موجودہ وائسرائے نے کچھ عرصے قبل، دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے پر، گاندھی کے ساتھ قائداعظم کو بھی بلایا۔ وجہ صرف یہی تھی کہ چونکہ اب مسلم لیگ مسلمانوں کی بھاری حمایت حاصل کر چکی تھی اس لیے اس جماعت کے صدر کی حیثیت

میں قائداعظم بھی اہم ہو گئے۔ یہ مثال بیان کرنے کے بعد قائداعظم نے کہا، ”میری مراد یہ ہے کہ آپ لوگ خود کو منظم کرنے کی اہمیت کو سمجھیں۔ انسان آتے رہیں گے اور انسان جاتے رہیں گے لیکن لیگ ہمیشہ زندہ رہے گی۔“[1]

”آپ لوگ خود کو منظم کرنے کی اہمیت کو سمجھیں!“ یہ الفاظ اب وہ آفاقی سچائی بن چکے ہیں جس سے انحراف کا نتیجہ تباہی، بربادی اور بے بسی کی موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ۲۰۰۷ء کے بعد سے دنیا بھر میں وہ تحریکیں اکثر ناکام ہو رہی ہیں جن کی قیادت کوئی بڑا رہنما کر رہا ہو۔ اوپر جن تحریکوں کا ذکر ہُوا ہے، اُن میں سے بھی بعض اُس وقت غیر موئثر ہو گئیں جب انہیں اپنے نمایندے منتخب کرنے کے لیے کہا گیا۔ وال اسٹریٹ پر قبضے کی تحریک اِس کی ایک نمایاں مثال ہے۔

*

بالکل اِسی طرح ۲۰۰۷ء کے بعد سے اگر کسی بھی جمہوری ملک میں ایک بڑا لیڈر اُبھرا ہے تو اُس کی وجہ سے معاشرہ بہت بری طرح تقسیم ہُوا ہے۔ امریکہ میں ڈونلڈ ٹرمپ، بھارت میں نریندر مودی اور پاکستان میں عمران خان صرف چند مثالیں ہیں۔

دُوسری طرف قد آور لیڈر صرف اُن معاشروں کو متحد رکھنے میں کامیاب ہو رہے ہیں جہاں وَن پارٹی سسٹم یا کسی اور طرح کی آمریت یا بادشاہت رائج ہے، جیسے رُوس، چین، شمالی کوریا اور سعودی عرب وغیرہ۔

اِس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں بڑے رہنماؤں کی تلاش جاری رکھنے والے جمہوری ممالک ڈکٹیٹرشپ کی آغوش میں چلے جائیں گے ورنہ اندورنی خلفشار کے

---

[1] Yusufi, *Speeches, Statements and Messages of the Quaid-e-Azam,* p. 1168

شکار ہو کر برباد ہوں گے۔ جمہوریت اب صرف اُسی صورت میں باقی رہ سکتی ہے اگر ”آپ لوگ خود کو منظم کرنے کی اہمیت کو سمجھیں!“۔

موجودہ زمانے میں کامیاب قیادت کی ایک دلچسپ مثال یوکرین کے صدر ولوڈومیر زیلینسکی (Volodymyr Zelensky) کی صورت میں سامنے آئی ہے جو ۲۰۲۲ء میں رُوس کے حملے کے بعد سے اپنے ملک کا دفاع کر رہے ہیں۔ جیسا کہ حضرتِ انساں میں بیان کیا گیا ہے، ”زیلینسکی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی سمجھی جاتی ہے کہ اُن میں کوئی ایسی بات نہیں جو یوکرین میں اُن کی جنریشن کے ہر شخص میں موجود نہ ہو۔ بعض ماہرین کے نزدیک یہی وجہ ہے کہ زیلینسکی اپنی قوم کو متحد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔“

*

پاکستان کی پرانی بیماری یعنی اِس کا تعلیم یافتہ طبقہ ابھی تک قوم کی ہر کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر کے اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کیے جا رہا ہے:

وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی!

(اقبال)[1]

۲۰۰۷ء میں تحریکِ وکلاء سے بوکھلا کر صدر پرویز مشرف نے آگ کو ڈیزل سے بجھانے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے ملک کی دونوں بڑی جماعتوں کے قائدین میاں نواز شریف اور محترمہ بینظیر بھٹو کے ساتھ معاہدے کر کے اُنہیں ایک طویل جلاوطنی کے بعد ملک واپس آنے کی اجازت دے دی۔ وہ دونوں اِس انداز میں واپس آئے کہ:

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نُما

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۵

لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

(اقبال)[1]

۲۰۰۷ء کے اواخر میں محترمہ بینظیر بھٹو پراسرار طور پر دنیا سے رخصت ہو گئیں جسے اُس وقت ایک حادثہ بتایا گیا اور بعد میں قتل کہا گیا۔

۲۰۰۸ء کے انتخاب میں اُن کی جماعت نے سب سے زیادہ نشستیں حاصل کر کے حکومت بنائی۔ جلد ہی صدر پرویز مشرف کو استعفے پر مجبور کر کے اُن کی جگہ مرحومہ بینظیر کے شوہر آصف علی زرداری کو صدر بنایا گیا۔

۲۰۱۳ء کے انتخاب کے بعد میاں نواز شریف کی لیگ اقتدار میں آئی لیکن عوام نے ایسا محسوس کیا جیسے اب دونوں بڑے سیاسی خاندانوں نے مختلف صوبوں کو ایک دوسرے کی جاگیریں تسلیم کر لیا ہو اور وفاقی حکومت کے لیے بھی اُن کے درمیان آپس میں باریاں مقرر ہو گئی ہوں۔

۲۰۱۴ء تک ملک کے مستقبل کے حوالے سے تشویش اور مایوسی انتہا کو پہنچ گئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب ملک کی آبادی میں نوجوانوں کا تناسب زیادہ ہو چکا تھا اور وہ اپنے ملک کے حوالے سے بہت خوبصورت خواب دیکھتے تھے۔ ۲۰۱۳ء کے انتخاب میں اُنہوں نے عمران خاں سے اُمیدیں وابستہ کی تھیں جو ماضی میں ایک مقبول کرکٹر رہ چکے تھے اور کافی عرصے سے پاکستان تحریکِ انصاف کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائے بیٹھے تھے۔ اب وہ بہت کھل کر روایتی سیاستدانوں کے خلاف بدعنوانی کے الزام لگا رہے تھے اور ملک کو موروثی سیاست سے نجات دلانے کا وعدہ کر رہے تھے۔

۲۰۱۴ء میں عمران خاں نے وزیرِاعظم نواز شریف سے حکومت چھوڑنے کا مطالبہ کیا

---

[1] اقبال، 'تعلیم اور اُس کے نتائج'، بانگِ درا، ص ۲۳۳

اور کئی ہفتوں تک اسلام آباد میں ''دھرنا'' دیا جسے میڈیا نے بھی خاصی شہرت دی اور عمران خاں کی جماعت نے سوشل میڈیا کا بھی خوب استعمال کیا۔ اگرچہ اُس دھرنے سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوئے لیکن پڑھے لکھے نوجوانوں میں سیاست سے ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی جو پہلے نہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی عام ہو گیا کہ جمہوریت کے نام پر موروثی سیاست کے کھیل کھیلے جا رہے ہیں جنہیں ختم ہونا چاہیے۔

۲۰۱۷ء میں ایک عدالتی فیصلے کے تحت نواز شریف کو نااہل قرار دے کر وزارتِ عظمیٰ سے ہٹا دیا گیا۔ اگلے برس، ۲۰۱۸ء میں، انتخاب ہوئے۔ نتائج کئی لحاظ سے متنازعہ رہے لیکن عمران خاں وزیرِ اعظم بن گئے۔ ساڑھے تین برس بعد، ۲۰۲۲ء میں، قومی اسمبلی کی اکثریت نے اُن کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ دے کر اُنہیں برطرف کر دیا۔

عمران خاں کے سیاسی اُفق پر چھا جانے کے بارے میں عام تاثر یہی تھا کہ اُنہیں فوج کی پشت پناہی حاصل ہے جو اِس دفعہ مارشل لا کے بغیر ہی ملک کو سیاسی بحران سے نکالنا چاہتی ہے۔ عمران خاں نے خود بھی اِس تاثر کو تقویت دی۔ البتہ اقتدار سے محروم ہونے کے بعد وہ فوجی قیادت کے خلاف محاذ آرا ہو گئے۔ مئی ۲۰۲۳ء میں اُنہیں بدعنوانی کے الزام میں گرفتار کیا گیا تو اُن کے حامیوں نے ملک گیر احتجاج کیا جس کے دوران فوجی تنصیبات کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔

اُس وقت سے یہ کتاب لکھے جانے تک (یعنی جنوری ۲۰۲۶ء تک) عمران خاں جیل ہی میں ہیں اور ''موروثی سیاست'' سے وابستہ خاندان اقتدار میں واپس آ چکے ہیں۔ نئی آئینی ترامیم کے ذریعے عدلیہ کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا ہے اور ریاست کے بعض عہدے داروں کو قانون کے سامنے جوابدہی سے تاحیات مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔

*

صرف پاکستان ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں تعلیم یافتہ طبقہ اور بہترین دانشور ابھی تک اِس بات کو محسوس نہیں کر سکے ہیں کہ عوام خود اپنے آپ کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور زمانے کی ہَوا بھی یہی ہے۔ دنیا کا تعلیم یافتہ طبقہ ابھی تک شخصیت پرستی کے سحر میں گرفتار ہے اور حقائق کو پرکھنے کی صلاحیت سے اِس حد تک محروم ہو چکا ہے کہ اُسے یہ بھی دکھائی نہیں دیتا کہ شخصیت پرستی کے نتائج مسلسل توقعات کے برعکس نکل رہے ہیں۔

جس طرح پاکستان کے تعلیم یافتہ طبقے نے جمہوریت اور مساوات کا شور مچاتے مچاتے خود ہی جمہوریت کے بجائے موروثی سیاست کو تسلیم کر کے شخصی آزادی کو ختم کرنے کا سامان فراہم کر دیا ہے، بالکل اُسی طرح ترقی یافتہ ممالک کی علم و دانش نے عملاً اُس بین الاقوامی قانون کو ختم کر دیا ہے جسے مہذب دنیا نے پچھلے ڈیڑھ دو سو سال میں بتدریج دریافت کیا تھا اور جس کے تحت ہر قوم کے آزاد رہنے کے حق کو تسلیم کیا جاتا تھا۔

۲۰۲۶ء کے آغاز ہی میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے حکم پر اُن کی افواج نے وینیزویلا (Venezuela) میں داخل ہو کر وہاں کے منتخب صدر اور اُس کی بیوی کو اُٹھا لیا اور اپنے ملک میں لا کر اُن پر مقدمہ چلا رہے ہیں۔ ساری دنیا نے اِسے وینیزویلا کی خودمختاری پر حملہ سمجھا لیکن حزبِ اختلاف کی رہنما ماریا کورینہ مچاڈو (María Corina Machado) نے، جنہیں پچھلے برس ہی نوبل امن انعام سے نوازا گیا تھا، صدر ٹرمپ کو نجات دہندہ قرار دیتے اپنا نوبل امن انعام صدر ٹرمپ کو پیش کر دیا۔

لطیفہ یہ ہے کہ نوبل انعام دینے والی کمیٹی نے اِس وضاحت کو کافی سمجھا ہے کہ وہ انعام کی اِس منتقلی کو تسلیم نہیں کرتی اور اُس کی نظر میں اب بھی وہ انعام مچاڈو ہی کی

ملکیت ہے۔ کیا اِس وضاحت سے نوبل انعام کی عزت بحال ہو جاتی ہے اور یہ سوال اٹھانے کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے کہ یہ انعام کس قماش کے لوگوں کو دیا جارہا ہے؟ نئے زمانے کے میر جعفروں اور میر صادقوں کو جو اپنے ملک کو غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھ بیچنے پر تیار بیٹھے ہوں؟ اگر نوبل انعام تعلیم یافتہ طبقے کی مجموعی فراست کا اظہار ہے، جیسا کہ سمجھا جاتا ہے، تو عہدِ حاضر کی تمام دانشوری کی انتہا کس نکتے پر ہو رہی ہے؟ نوآبادیاتی نظام کو دوبارہ زندہ کرنا جس کے تحت کسی بھی کمزور ملک پر کسی بھی طاقتور ملک کا قبضہ جائز قرار دے دیا جائے!

بات صرف وینزویلا کی غدار رہنما تک محدود نہیں ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اور اُس پر تعلیم یافتہ طبقے کے بہترین نمایندے جس طرح اظہارِ خیال کر رہے ہیں اُس سے یہی ظاہر ہے کہ عہدِ حاضر کی دانشوری اب ایک نئے نوآبادیاتی نظام اور ایک نئی قسم کی شہنشائیت کو تسلیم کروانے پر مصر ہے۔

۲۰۲۲ء سے رُوس اور یوکرین کی جنگ جاری ہے جس کی ابتدا یوکرین پر رُوس کے حملے سے ہوئی تھی۔ ۲۰۲۶ء تک پہنچتے پہنچتے مغربی دنیا کے رہنما اِس بات کے اشارے کرنے لگے ہیں کہ رُوس نے یوکرین کے جن علاقوں پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے اُنہیں رُوس کے سپرد کر کے جنگ ختم کی جائے۔

امریکی صدر ٹرمپ نے گرین لینڈ پر قبضہ کرنے کا مطالبہ کر رکھا ہے جس کے جواب میں اب یورپ کے بڑے رہنماؤں اور سپہ سالاروں کی طرف سے یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ پورے گرین لینڈ کے بجائے اُس ملک کے کچھ علاقے امریکہ کے حوالے کر کے امریکی صدر کو خوش کر دیا جائے۔

لبنان اور شام میں بین الاقوامی طاقتوں کے فوجی اڈوں کو جائز تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

فلسطین میں غزہ پر اسرائیل کی طرف سے جو مظالم ڈھائے گئے ہیں اُس کے خلاف دنیا بھر کے عوام نے احتجاج کیے ہیں یہاں تک کہ اسرائیل سے باہر رہنے والے بہت سے یہودی بھی اُس احتجاج میں شریک رہے ہیں۔ لیکن اُس کے حل کے لیے دنیا بھر کے رہنما جس تجویز پر متفق ہوتے دکھائی دے رہے ہیں وہ اُس خطے کے متعلق صدر ٹرمپ کی ایسی تجاویز ہیں جو فلسطینی عوام کی مرضی کے بغیر اُن پر مسلط کی جا رہی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس وقت دنیا کے بہترین تعلیم یافتہ ذہنوں کی طرف سے جو خیالات پیش کیے جا رہے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ عہدِ حاضر کی دانشوری اب ایک نئے نوآبادیاتی نظام اور ایک نئی قسم کی شہنشائیت کو تسلیم کروانے پر مصر ہے۔ یہ ہے اُس تعلیم کی کُل اوقات جس کے غرور میں ہمارے تعلیم یافتہ لوگ کم پڑھے لکھے، غریب اور دیانتدار لوگوں کو عقل و شعور سے محروم قرار دیتے رہے ہیں:

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!

(اقبال)[1]

*

اِس کے باوجود جس طرح پچھلے ہر مرحلے کے اختتام پر قراردادِ دہلی کا اصول معجزانہ طور پر پہلے سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلتا رہا ہے (یعنی ۱۹۶۶ء میں معاہدۂ تاشقند، ۱۹۸۵-۸۶ء میں سارک اور ۲۰۰۶ء میں معاہدۂ لندن) بالکل اُسی طرح ساتویں مرحلے کے اختتام پر ۲۰۲۶ء میں بھی یہ اصول اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ وسیع پیمانے پر ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن

[1] اقبال، 'لینن (خدا کے حضور میں)'، بالِ جبریل، ص ۱۴۶

اِس دفعہ یہ صرف کسی ایک خطے کو نہیں بلکہ پوری دنیا کو روشنی دکھا رہا ہے۔ ایک ایسی روشنی جو اُمید کی آخری کرن ہے!

ساتویں مرحلے کے آخری برسوں میں، یعنی ۲۰۲۴ء سے ۲۰۲۶ء کے عرصے میں، اچانک پاکستان کو دنیا میں ایک ایسی اہمیت حاصل ہو گئی ہے جو ہمارے کسی حکمراں، باثر شخصیت یا ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے بنائے ہوئے کسی منصوبے کا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ یکے بعد دیگرے کئی اتفاقات اِس انداز میں پیش آئے ہیں اور خطے کے عوام نے اُن پر کچھ ایسے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے کہ اُن سب کے مجموعی اثرات نے آج پاکستان کو ایک ایسی طاقت بنا دیا ہے کہ چند لمحوں کے لیے ضرور دنیا کے آیندہ مستقبل کا انحصار پاکستان کے اقدامات پر منحصر دکھائی دیتا ہے۔

۲۰۲۴ء میں بنگلہ دیش کے عوام نے وہاں کی وزیرِ اعظم شیخ حسینہ واجد کو حکومت سے بے دخل کر کے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے بعد بنگلہ دیش میں پاکستان کے ساتھ اپنے مشترکہ ماضی کا کھل کر اعتراف کیا جانے لگا ہے اور بنگلہ دیش نے بھارت کی طرف جھکاؤ ختم کر دیا ہے اور پاکستان کے ساتھ تعلقات اُس کی خارجہ پالیسی کا اہم ستون بن گئے ہیں۔

چین، جس کے ساتھ پاکستان کی دوستی بہت پرانی اور مثالی رہی ہے، ساتویں مرحلے کے آغاز یعنی ۲۰۰۷ء ہی سے ایک عالمی طاقت بننے کی طرف گامزن ہو گیا تھا۔ چونکہ چین کے بین الاقوامی راستوں کے پروجیکٹ، سی پیک (CPEC) میں پاکستان ایک اہم کڑی ہے لہٰذا اِس حوالے سے بھی پاکستان کی جغرافیائی اہمیت میں اضافہ ہونے لگا۔ جب ۲۰۲۵ء میں بھارت نے دہشت گردی کا الزام لگا کر پاکستانی سرحدوں کے اندر فضائی حملے کیے تو جوابی کاروائی میں پاکستانی افواج بالخصوص فضائیہ نے بھارت پر واضح عسکری برتری

حاصل کر کے دنیا کو حیران کر دیا۔

چونکہ اُس کاروائی میں پاکستان نے چینی ٹیکنالوجی اور بھارت نے مغربی ٹیکنالوجی استعمال کی تھی، اِس لیے مغربی ٹیکنالوجی پر چینی ٹیکنالوجی کی برتری ثابت کرنے میں بھی پاکستان ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ چنانچہ کم سے کم اِس وقت تو پاکستان کی اہمیت چین کے لیے بھی پہلے سے زیادہ بڑھ چکی ہے، مسلم دنیا کے بعض ممالک بھی پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدے کر رہے ہیں اور امریکہ سمیت باقی دنیا بھی پاکستان کو ایک بڑی طاقت کے طور پر دیکھ رہی ہے۔

اب اِس بات کے آثار بھی دکھائی دے رہے ہیں کہ ایشیائی طاقتوں کا ایک نیا بلاک وجود میں آ جائے۔ طاقت کے اُس نئے توازن میں پاکستان کے جغرافیائی محلِ وقوع کی اہمیت بھی پہلے سے زیادہ نمایاں ہو سکتی ہے۔

*

یہ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے پاکستانی قوم کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ ہے۔ موجودہ علوم کی روشنی میں یہ ناقابلِ یقین ہی دکھائی دے گا۔ اِس میں قوم کی روح قدرت کے ایک قانون کی طرح متحرک دکھائی دیتی ہے جبکہ موجودہ علوم انسانی معاشرے میں کسی ایسی اجتماعی روح کے وجود پر یقین نہیں رکھتے جو قدرت کے کسی اٹل قانون کے تابع ہو۔

لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ خود یورپ کی انلائٹمنٹ کے وہ مفکر جنہوں نے جدید تہذیب کی اصل بنیاد رکھی، قوم کی اجتماعی روح پر یقین رکھتے تھے اور قدرت کے اُس قانون کو دریافت کرنے کے خواہشمند تھے جو اُس اجتماعی روح کے ذریعے اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے (اُن مفکرین میں سے رُوسو اور کانٹ کے نظریات کا تذکرہ اِس کتاب میں کیا جا

چکا ہے)۔

پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء) کے بعد پیدا ہونے والی مایوسی نے مغرب میں سماجی علوم کے ماہرین کو اِن نظریات سے انکار پر مجبور کر دیا لیکن مسلم لیگ تو اِن پر یقین کرتی رہی۔ اِس لیے مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے پاکستان کی تاریخ تو بہرحال قوم کی روح کی داستان ہی ہو گی اور وہ قدرت کے ایک قانون کے تحت کام کرتی ہی دکھائی دے گی۔ ورنہ وہ تاریخ کم سے کم مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے لکھی ہوئی تاریخ نہیں کہلائے گی:

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
اسی نگاہ سے محکُوم قوم کے فرزند
ہوئے جہاں میں سزاوارِ کار فرمائی
نگاہِ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
ترا وجود ہے قلب و نظر کی رُسوائی

(اقبال)[1]

۱۹۳۰ء میں اقبال نے جس خطبۂ الٰہ آباد میں پاکستان کا تصوّر پیش کیا اُس کی تان بھی اِسی بات پر جا کر ٹوٹی کہ "ہندوستان میں چیزیں ویسی نہیں ہیں جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ اِس کے معانی آپ پر اُس وقت واضح ہوں گے جب آپ اُنہیں دیکھنے کے لیے ایک حقیقی اجتماعی خودی حاصل کر لیں گے۔"[2]

اُس حقیقی اجتماعی خودی کا حاصل کرنے کے لیے اُنہوں نے ۲۰ / مارچ ۱۹۳۷ء کو

[1] اقبال، 'نگاہِ شوق'، ضربِ کلیم، ص ۱۰۹

[2] Sherwani, *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*, p. 29

قائداعظم کے نام ایک خط میں لکھا:

> آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کنونشن بلائیں جس میں آپ نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں اور دوسرے ممتاز مسلم رہنماؤں کو بلائیں۔ اس کنونشن میں آپ پوری وضاحت اور قوت کے ساتھ ہندوستان میں ایک جداگانہ سیاسی وحدت کے طور پر مسلمانوں کے نصب العین کا اعلان کر دیں۔[1]

قائداعظم نے اُس اجلاس کے لیے مناسب حالات کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔ وہ حالات نَو برس بعد پیدا ہوئے چنانچہ اپریل ۱۹۴۶ء میں وہ اجلاس دہلی میں بالکل اُسی طرح بلایا گیا جس طرح اقبال نے تجویز دی تھی (جو ۱۹۳۸ء میں فوت ہو چکے تھے)۔ یہی اجلاس تھا جہاں قراردادِ دہلی بھی منظور ہوئی اور مسلم لیگ کی اطاعت کا حلف بھی اٹھایا گیا۔

چنانچہ اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد میں جس "حقیقی اجتماعی خودی" کی بات کی تھی اُس کے ترجمان بھی قراردادِ دہلی اور لیگ کی اطاعت کا حلف ہی ہیں۔ ان کی روشنی میں تاریخ کو دیکھنے سے چیزیں ویسی دکھائی نہیں دینی چاہئیں جیسی اِن کے بغیر نظر آتی ہیں۔ اقبال نے یہی کہا تھا ("ہندوستان میں چیزیں ویسی نہیں ہیں جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ اِس کے معانی آپ پر اُس وقت واضح ہوں گے جب آپ اُنہیں دیکھنے کے لیے ایک حقیقی اجتماعی خودی حاصل کر لیں گے")۔

وہ حقیقی اجتماعی خودی یا قوم کی روح اپنا کام دکھا چکی ہے۔ اُس نے ہمارے عمرانی معاہدے کی سچائی کو مرحلہ بہ مرحلہ ثابت کیا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں برصغیر پر، ۸۶-۱۹۸۵ء میں جنوبی ایشیا پر، ۲۰۰۶ء میں مغرب پر اور اب ۲۰۲۶ء میں ساری دنیا پر!

دُوسری طرف ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے اپنے عمرانی معاہدے کے بجائے اُس

---

[1] Iqbal, 22 April 1937; *Letters of Iqbal to Jinnah,* p. 15

علم پر بھروسہ کیا جو دنیا نے ہماری جھولی میں ڈال دیا ہے اور جو حقیقت میں جہالت سے بدتر ہے۔ اب اِس غلطی کی گنجائش نظر نہیں آرہی ہے۔ کیونکہ اب اُس علم نے بھی اپنے فریب کا نقاب اُتار کر ہمیں اپنا مکروہ چہرہ دکھادیا ہے۔ آج وہی علم ہم سے اور دنیا سے تقاضا کر رہا ہے کہ شخصی آزادی کے بجائے منتخب شہنشاہوں کے سروں پر تاج سجائے جائیں اور کمزور ممالک پر طاقتور قوموں کے قبضے کو جائز سمجھ لیا جائے:

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوَس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزای ہے

(اقبال)[1]

آج ہمارے سامنے صرف دوراستے ہیں۔ پہلا راستہ یہ ہے کہ پاکستان جس اصول پر قائم کیا گیا تھا ہم اُسے بحال کر کے اپنی قومی زندگی کو آل انڈیا مسلم لیگ کے نظریات کے مطابق اُستوار کریں جو ہم نے ۱۹۵۳ء کے بعد کبھی نہیں کیا۔ اگر ہم ایسا کر سکیں تو اپنے ملک کی آزادی اور سلامتی کو بھی برقرار رکھ سکتے ہیں اور شاید دنیا کو بھی جبر کے اُس نظام سے نجات دلا سکیں جو بظاہر اب مشرق و مغرب میں ہر جگہ قائم ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ دوسرا راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی روِش پر قائم رہیں اور باقی دنیا کے ساتھ ہم بھی جبر کے اندھیروں میں ڈوب جائیں:

دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد
سالکِ رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ!

(اقبال)[2]

---

[1] اقبال، 'طلوعِ اسلام'، بانگِ درا، ص ۳۱۳

[2] اقبال، بالِ جبریل، ص ۵۳

ضمیمے

۱۔ قراردادِ دہلی، ۸/ اپریل ۱۹۴۶ء

۱۹۴۶ء میں دہلی میں مسلم لیگ لیجسلیٹرز کنونشن نے ۸/ اپریل کو ایک قرارداد پیش کی اور آدھی رات کے بعد اُسے متفقہ طور پر منظور کیا۔ اُس اجلاس کا حال آٹھویں باب، ''عہدِ وفا''، میں دیکھا جاسکتا ہے۔ قرارداد کی اہمیت کی وجہ سے اُس کے مکمل متن کا ترجمہ یہاں شامل کیا جارہا ہے۔

جبکہ ہندوستان کے اِس وسیع برِ صغیر میں دس کروڑ مسلمان ایک ایسے عقیدے کے پیرو ہیں جو اُن کی زندگی کے ہر شعبے (تعلیمی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی) میں نافذ ہے، جس کا ضابطہ محض روحانی تعلیمات اور عقائد، اور رسومات و تقریبات تک محدود نہیں ہے، اور جو ہندو دھرم اور فلسفے کی اُس امتیازی نوعیت سے ٹکراتا ہے جس نے ہزاروں سال سے ذات پات کے ایک منجمد نظام کو پروان چڑھا کر چھ کروڑ انسانوں کو اَچھوت بنا دیا ہے، جس نے انسان اور انسان کے درمیان غیر فطری دیواریں کھڑی کی ہیں، اور جس کی وجہ سے مسلمان، عیسائی اور دوسری اقلیتیں سماجی اور اقتصادی طور پر دائمی غلامی کے خطرے سے دوچار ہیں؛

جبکہ ذات پات کا ہندو نظام قومیت، مساوات، جمہوریت اور اُن تمام بلند مقاصد کی کھلی خلاف ورزی ہے جن کی اسلام نمایندگی کرتا ہے؛

جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مختلف تاریخی پس منظر، روایات، ثقافت، اور سماجی اور

اقتصادی نظاموں کی وجہ سے ناممکن ہے کہ ایک واحد ہندوستانی قوم ارتقا پاسکے جس کے ارمان اور نصب ُالعین مشترک ہوں، اور صدیوں بعد بھی وہ ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف دو قومیں ہیں؛

جبکہ ہندوستان میں مغربی جمہوریت کی طرز کے سیاسی ادارے متعارف کروانے کی برطانوی پالیسی کے نفاذ کے بعد جلد ہی واضح ہو گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قوم یا معاشرے کی اکثریت دوسری قوم یا معاشرے کی اکثریت پر اُس کی مرضی کے خلاف حکومت کرے گی، جیسا کہ 1935 کے دستورِ ہند کے تحت ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرس کی حکومت کے ڈھائی سال میں کُھل کر سامنے آ گیا جب مسلمانوں کو ناگفتہ ہراس اور ظلم کا نشانہ بنایا گیا، جس کے بعد وہ دستور میں فراہم کیے ہوئے نام نہاد تحفظات اور گورنروں کو دی ہوئی ہدایات کے بے اثر ہونے کے قائل ہو کر اِس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ اگر ایک متحدہ ہندوستانی وفاق قائم ہوا تو مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی حالت کچھ بہتر نہ ہو گی، اور اُن کے حقوق اور مفادات مرکز کی مستقل ہندو اکثریت کے ہاتھوں محفوظ نہ رہیں گے؛

جبکہ مسلمانوں کو یقین ہے کہ مسلم ہندوستان کو ہندوؤں کے تسلط سے بچانے اور مسلمانوں کو اپنی قدرتی صلاحیتوں کے مطابق خود کو ترقی دینے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ شمال مشرقی حصے میں بنگال اور آسام، اور شمال مغربی حصے میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل خود مختار ریاست قائم کی جائے؛

ہندوستان کے مرکزی اور صوبائی مسلم لیگی قانون سازوں کا یہ کنونشن گہرے غور وخوص کے بعد اعلان کرتا ہے کہ مسلم قوم کبھی ایک متحدہ ہندوستان کے لیے آئین قبول نہ

کرے گے اور کبھی اس مقصد کے لیے بننے والے واحد دستور ساز ادارے میں شریک نہ ہو گی، اور ہندوستان کے عوام کو اقتدار منتقل کرنے کے لیے برطانوی حکومت کا کوئی فارمولا ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے میں مفید نہ ہو گا اگر وہ مندرجہ ذیل اصولوں کے مطابق نہ ہوا جو انصاف پر مبنی ہیں اور ملک میں داخلی امن و سکون قائم رکھنے والے ہیں:

- کہ بنگال اور آسام پر مبنی شمال مشرقی حصہ اور پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مبنی شمال مغربی حصہ، یعنی پاکستانی حصے، جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، ایک آزاد خود مختار ریاست بنایا جائے اور کسی تاخیر کے بغیر پاکستان کے قیام پر عمل درآمد کرنے کا حتمی وعدہ کیا جائے؛
- کہ پاکستان اور ہندوستان کے عوام اپنے اپنے آئین کی تشکیل کے لیے دو علیحدہ دستور ساز ادارے قائم کریں؛
- کہ پاکستان اور ہندوستان میں اقلیتوں کو آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں منظور کی ہوئی قرارداد کے مطابق تحفظات فراہم کیے جائیں؛[1]
- کہ مرکزی میں عبوری حکومت کی تشکیل میں مسلم لیگ کے تعاون اور شمولیت کی بنیادی شرط مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی قبولیت اور اس پر بلا تاخیر عمل درآمد ہے؛

مزید برآں یہ کنونشن پرزور اعلان کرتا ہے کہ متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر کسی آئین کو نافذ کرنے

[1] قراردادِ لاہور میں کہا گیا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم علاقوں میں اقلیتوں کے تمام حقوق ''اُن کے ساتھ مشاورت کے ذریعے طے کیے جائیں۔''

یا مسلم لیگ کے مطالبے کے برعکس مرکز میں کوئی عبوری بندوبست نافذ کرنے کی کوئی بھی کوشش مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ چھوڑے گی کہ اپنی بقا اور قومی وجود کی خاطر ہر ممکن طریقے سے اس کی مزاحمت کریں۔

۲۔ مسلمانوں کا حَلف، ۸/ اپریل ۱۹۴۶ء

مسلم لیگ لیجسلٹرز کنونشن کے موقع پر جو حلف تمام نمایندوں نے اُٹھایا، اور جو بعد میں قائداعظم نے برصغیر کے تمام مسلمانوں کو بھی اُٹھانے کی تاکید کی، اُس کا ذکر بھی آٹھویں باب، ''عہدِ وفا'' میں آچکا ہے۔ حلف کا مکمل متن یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''کہہ دیجیے کہ میری عبادت اور قربانی، اور میرا جینا اور مرنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے'' (قرآن)

میں اپنے اِس پختہ عقیدے کا باقاعدہ اعلان کرتا / کرتی ہوں کہ ہندوستان کے اِس برصغیر میں آباد ملتِ اسلامیہ کا تحفظ اور سلامتی، اور نجات اور تقدیر صرف پاکستان کے حصول پر موقوف ہے، جو دستوری مسئلے کا واحد منصفانہ، عزت دارانہ اور عادلانہ حل ہے، اور جو اِس عظیم برصغیر کی مختلف قوموں اور ملّتوں کے لیے امن، آزادی اور خوشحالی لائے گا؛

میں پوری ذمہ داری کے ساتھ اقرار کرتا / کرتی ہوں کہ پاکستان کے عزیز قومی نصبُ العین کے حصول کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے شروع کی جانے والی کسی بھی تحریک پر عمل درآمد کے لیے اُس کی طرف سے جاری ہونے والے تمام احکامات اور ہدایات کی دلی رضامندی اور استقامت کے ساتھ اطاعت کروں گا / گی، اور چونکہ مجھے

اپنے مقصد کے حق و انصاف پر مبنی ہونے کا یقین ہے، میں ہر اُس خطرے، امتحان یا قربانی سے گزرنے کا حلف اٹھاتا/اٹھاتی ہوں جس کا مجھ سے تقاضا کیا جائے۔

"اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کفار کی قوم کے خلاف ہماری مدد فرما!" (قرآن)۔ آمین![1]

[1] Syed Sharifuddin Pirzada (2008), *AIML Centenary Souvenir*, pp.321-323, 338

ایک تعلیمی و تربیتی مشن

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

الہجرہ سکولز ٹرسٹ کا مقصد یہ ہے کہ ایسی تعلیم فراہم کی جائے جو اِسلامی معاشرتی انصاف پر مبنی ایک روشن خیال اور خوشحال معاشرے کے قیام کی راہ ہموار کرے۔ نیز یہ تعلیم بین الاقوامی معیار کے مطابق ہو لیکن پسماندہ ترین طبقات کے چشم و چراغ بھی اِس سے محروم نہ رہیں۔ اِس فلاحی تحریک کو دردِ دل رکھنے والے پُرعزم بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں نے اپنے بانی چیئرمین جناب محمد عبدالکریم ثاقب کی سرپرستی میں قائم کیا۔

۱۴/ اپریل ۲۰۰۴ء کو زیارت (بلوچستان) میں الہجرہ ریذیڈینشل سکول اینڈ کالج کا قیام اِس ادارے کا پہلا پروجیکٹ تھا۔ اُس کی کامیابی اور معاشرے کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ۲۷/ اگست ۲۰۲۳ء کو جنوبی پنجاب اور سندھ کے بچوں کے لیے ڈیرہ غازی خان پروجیکٹ کا آغاز کیا گیا۔

یہ دونوں کیمپس پسماندہ علاقوں کے مستحق اور باصلاحیت طلبہ کو مکمل طور پر مفت رہائشی تعلیم و تربیت فراہم کر رہا ہے۔ ۲۰۲۶ء کے آغاز تک ۶۰۳/ طلبہ اِن دونوں کیمپسوں سے فارغ التحصیل ہو چکے ہیں اور ۴۸۰/ زیرِ تعلیم ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ سلسلہ نہ صرف جاری رہے گا بلکہ مزید پھیلے گا اور الہجرہ ایسے ڈاکٹرز، انجینئرز اور بیوروکریٹس تیار کرتا رہے گا جو اپنے کیریئر کو محض ذاتی فائدہ نہیں بلکہ ایک قومی ذمہ داری اور ربِ کائنات کی امانت سمجھ کر انسانیت کی خدمت کریں۔

ادارے کی ۲۲ر سالہ بے لوث خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے ادارے کے بانی چیئرمین جناب محمد عبدالکریم ثاقب کو اعلیٰ قومی ایوارڈ "ستارہِ امتیاز" کے لیے بھی نامزد کیا ہے۔

الہجرہ المنائی پاکستان
(AAP)

یکم اکتوبر ۲۰۱۰ء کو الہجرہ المنائی پاکستان (AAP) کے نام سے ایک رجسٹرڈ تنظیم بھی قائم کی گئی جو الہجرہ کے کیمپسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ پر مبنی ہے۔ اِس کا بنیادی مقصد سابق طلبہ کو اپنی مادرِ علمی اور ایک دُوسرے کے ساتھ مربوط رکھنا ہے تاکہ وہ مل کر معاشرے میں مثبت سوچ، انسانیت، اسلامیت اور پاکستانیت کے جذبوں کو پروان چڑھا سکیں۔ یہ تنظیم محض نعروں کے بجائے تعمیری مباحثے اور عملی جدوجہد پر یقین رکھتی ہے اور اِس کی قیادت منتخب صدر اور جنرل سیکرٹری کرتے ہیں۔

تنظیمی سطح پر الہجرہ الہجرہ المنائی پاکستان کو پورے ملک میں مختلف زونز میں تقسیم کیا گیا ہے جہاں ہفتہ وار اسٹڈی سرکلز کے ذریعے ممبران اپنی فکری اور اخلاقی تربیت کو جاری رکھتے ہیں۔ ۲۰۲۶ء کے آغاز میں جب یہ سطور لکھی جارہی ہیں، الہجرہ سے فارغ التحصیل ہونے والے سولہ بَیچز کے تمام ۶۰۳ر طلبہ اِس تنظیم کے رُکن ہیں اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔

خرّم علی شفیق

اقبال سائنسز سیریز

اقبال سائنسز(Iqbal Sciences)سے مراد یہ ہے کہ تمام سماجی علوم کو نئے سرے سے اُن اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے جو علامہ اقبال نے متعین کر دیئے تھے۔ یہ زاویۂ نگاہ معروف ماہرِ اقبالیات خرّم علی شفیق کی تحقیقات کا نتیجہ ہے، جسے وہ ۲۰۰۷ء سے اپنی تصانیف میں پیش کر رہے ہیں۔ اب الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت اِس نئے علم کے خلاصے کو ایک باقاعدہ سیریز کے طور پر پیش کیا جارہا ہے جسے خرّم علی شفیق نے خود تصنیف کیا ہے۔

یہ کتابیں سب کے لیے ہیں کیونکہ ان میں جو تحقیقات پیش کی جارہی ہیں اُن سے اہلِ علم بھی عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ اِس لحاظ سے اِن کتابوں کی ضرورت طلبہ کو بھی ہے، اور ماہرین اور اساتذہ کو بھی!

الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت پیش کی جانے والی یہ سیریز نَو کتابوں پر مبنی ہیں۔ ہر کتاب اپنی جگہ مکمل ہے اس لیے قارئین اپنے ذوق کے لحاظ سے اِن میں سے کسی بھی کتاب سے آغاز کرسکتے ہیں۔ چونکہ ہر کتاب میں دُوسری کسی نہ کسی کتاب کا حوالہ بھی شامل ہے اِس لیے آپ ان کتابوں کو جس ترتیب میں بھی پڑھیں گے، بہرحال وہ آپس میں مربوط ہوتی چلی جائیں گی۔

مصنف اور ناشر کی طرف سے اِن کتابوں کو جس ترتیب میں رکھا گیا ہے، وہ اگلے صفحے پر ہر کتاب کے موضوع کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔

اقبال سائنسز کی کتابیں

مصنف: خرّم علی شفیق

ناشر: الہجرہ سکولز ٹرسٹ

زندگی کی کتاب

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سرگزشتِ آدم

قدیم زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

حضرتِ انسان

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سیمرغ

عطار کی منطق الطّیر اقبال کی نظر سے

آزادی

تحریکِ پاکستان کی مختصر تاریخ

آزادی کے بعد

پاکستان کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے ۲۰۲۶ء تک

قومی ادب

پاکستانی ادب اقبال کی نظر سے

قائداعظم کے سیاسی اصول

علمِ سیاسیات اقبال کی نظر سے

اقبال کا فلسفہ سب کے لیے

فکرِ اقبال کے نَو بنیادی اصول

آزادی کے بعد

1947ء سے 2026ء تک پاکستان کی تاریخ
آل انڈیا مسلم لیگ کے نقطۂ نظر سے

خرّم علی شفیق

پاکستان بنانے والی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کو قیامِ پاکستان کے صرف چند برس بعد بڑی بے دردی اور بے حسی کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔ لیکن اُس کا نقطۂ نگاہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اگر ہم قیامِ پاکستان سے آج تک کی تاریخ کو اُس نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو ہماری قومی زندگی کے بعض راز کھل جاتے ہیں اور ایک نئی دنیا ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اِس کتاب میں یہی کیا جا رہا ہے۔ اِسے پڑھنے کے بعد پاکستان کے بارے میں آپ کی سوچ بدل جائے گی۔

9786277400019

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

وقف الهجرة
AL-HIJRAH

Art: Khurram Ali Shafique using AI | Design: Syed Ahsan Ali